ہے کہ دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں، ص ۷۱ پر لکھا ہے کہ "بخت نصر کے وقت یہودیوں کی یہ بحث کہ حضرت مسیحؑ کے فضلات پاک تھے یا ناپاک" حالانکہ بخت نصر کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے قبل تھا، ایک جگہ "التماس" کو مذکر لکھا ہے، ممکن ہے یہ سہو کتابت کا نتیجہ ہو، اس تحریر کا جماعت اسلامی کے ایک پرجوش کارکن جناب غلام علی نے ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں جواب دیا تھا، مصنف نے البلاغ میں ان کے خیالات کی تردید کی تھی، یہ مضمون اس کتاب کے دوسرے حصہ میں شامل ہے، تیسرے حصہ میں امیر المومنین حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل و مناقب درج ہیں، جن کو پڑھ کر ان کی عظمت، کمالات اور کارناموں کا اندازہ ہو جاتا ہے، یہ حصہ ان کے برادر زادہ مولوی محمود اشرف عثمانی کا تحریر کردہ ہے، اگر مصنف اس پر ایک نظر ڈال لیتے تو عبارت کی تکرار اور تحریر کی ناہمواری دور ہو جاتی۔

تفسیر ماتریدی (سورۂ فاتحہ): تحقیق و ترجمہ ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی متوسط تقطیع کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ صفحات ۲۰۵ قیمت تحریر نہیں پتہ:۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد پاکستان،

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی، امام ابو حنیفہؒ کے عقائد و کلامی مذہب کے ترجمان ہونے کی بنا پر متکلمین احناف کے پیش رو اور امام سمجھے جاتے ہیں، انکے اعتقادی مذہب کو بلاد ماوراء النہر وغیرہ میں وہی اہمیت حاصل تھی جو عرب ممالک میں اشاعرہ کو حاصل تھی، کلام کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی انکی متعدد تصنیفات تھیں مگر یہ سب ناپید ہیں، البتہ انکی تفسیر تاویلات السنۃ کا ایک قدیم مخطوطہ استنبول میں موجود تھا جسکا عکسی نسخہ دار الکتب المصریہ میں بھی تھا، اسی کی مائکرو فلم ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان نے حاصل کر کے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا متن مع اردو ترجمہ شائع کیا ہے اور آیندہ دوسرے حصوں کی اشاعت بھی پیش نظر ہے، مگر اب المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ نے بھی تفسیر کی پہلی جلد شائع کر دی ہے، سورہ فاتحہ کی یہ مختصر تفسیر اپنی قدامت اور مفید مطالب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لائق مطالعہ ہے، شروع میں فاضل مترجم نے امام ابو منصور کے حالات و کمالات اور تفسیر کی خصوصیات تحریر کی ہیں۔

"ض"

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۹ء عدد ۵

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

شذرات

ایران میں غیر معمولی انقلاب آیا، وہاں بادشاہت ختم ہوگئی، خیال ہے کہ اب اسلامی جمہوریت قائم ہوگی، دنیا کے سیاسی پیشواؤں کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں، کہ یہ انسانی فلاح و بہبود کیلئے کس طرح موثر اور کارآمد ثابت ہوتی ہے،

اس انقلاب کے لانے میں وہاں کے مذہبی پیشوا آیت اللہ خمینی کا بہت بڑا کارنامہ ہے، وہ پندرہ[15] برس پہلے جلا وطن کر دیئے گئے تھے، فرانس میں مقیم رہے، مگر جب شاہِ ایران کے خلاف بغاوت پھیلی تو انھوں نے فرانس ہی میں بیٹھ کر جو چاہا وہی ہوا، شاہ کو تاج و تخت چھوڑنا پڑا، ان کا شاہانہ دبدبہ کچھ کام نہ آسکا، امریکہ جیسا دولت مند ملک بھی ان کیلئے بے اثر رہا، انکی مسلح فوج اُن کی تائید میں تھی مگر وہ تمام حربی اسلحہ جن کی دھوم انھوں نے دنیا میں مچا رکھی تھی، عوام کے مشتعل جذبات کے آگے دھرے کے دھرے رہ گئے، آیت اللہ خمینی فرانس سے ایران آئے تو اُن کا استقبال اس طرح ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی ساری شاندار روایات کو اپنے دوش پر ساتھ لائے ہیں، اور وہ مغربی جمہوریت اور روسی اشتمالیت کے مقابلہ میں ایک ایسی اسلامی حکومت قائم کریں گے، جو موجودہ سیاسی نظام سے بیزار دنیا کے لیے ایک مثال ہوگی،

اس انقلاب کے بعد اس کے مخالفوں کے ساتھ ایران میں جو سلوک ہو رہا ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے بجائے یورپی سیاست کا اہرمن کام کر رہا ہے، جب ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو بقول مولانا شبلی جبارانِ قریش سامنے تھے، جن میں وہ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں

پیش پیش تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے نہیں بجھتی تھی، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی آگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، رحمتِ عالم نے اُن کی طرف دیکھا اور پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں، وہ لوگ اگرچہ ظالم تھے اور شقی تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے، تو شریف بھائی ہے، پھر ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے بجائے ایران فرانس کے ۱۷۹۷ء کے مشہور انقلاب کی روایت کو دہرا رہا ہے، جہاں ایک انقلاب پسند فرقہ جیکوبن نے آئین اور دستور کا سہارا لینے کے بجائے تحفظِ امنِ عامہ کے نام پر دہشت پھیلائی، اقتدار حاصل کر کے ایک انقلابی عدالت قائم کی، جس کے سامنے عورتیں اور مرد ملک کے خلاف جرائم کے ارتکاب کرنے کے جرم میں پیش ہوتے، ایک سرسری تحقیقات کے بعد ان کو گلوٹین یعنی قتل کر دیا جاتا، بادشاہ لوئی شانزدہم کے ساتھ اسکی ملکہ میری انٹی نوانٹ بھی دار پر چڑھائی گئی، جو لوگ جیکوبن کی مخالفت کرتے، غدار سمجھ کر مار ڈالے جاتے، کوئی ایک دوسرے کی ہمسری پسند نہیں کرتا، بڑے بڑے اربابِ نظر و فکر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، پھر انقلاب میں حصہ لینے والے اعتدال پسند لوگ بھی بدخواہ قرار دئے گئے جو ایک ایک کر کے یا تو قید خانہ بھیج دیئے گئے، یا سولی کی نذر ہوگئے، پھر جب باہمی اختلاف پیدا ہوگیا تو افراتفری میں جو لوگ برسرِ اقتدار آئے، انھوں نے مسیحیت کو ختم کر کے عقل کی پرستش کا حکم دیا،

ایران میں فرانس ہی کے مشہور انقلاب کا نقشہ اس وقت سامنے ہے، شاہِ ایران کے اکابر حامی لقمۂ اجل بنائے جا رہے ہیں، وہاں ایک اسلامی انقلابی عدالت قائم ہوئی ہے جس کے سامنے صبح کو مجرم پیش کیئے جاتے ہیں، اور شام کو غداری کے جرم میں ان کو گولی مار دی جاتی ہے، ہمسری یا اعتدال پسندی برداشت نہیں کی جا رہی ہے، آیت اللہ خمینی اب تک بے تاج کے

بادشاہ بنے لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے، مگر ان کے خلاف بھی آواز بلند ہو رہی ہے اور ان کے حامیوں پر گولیاں چلنے لگی ہیں،

.....

ڈر ہے کہ اس باہمی اختلاف آویزش سے کہیں مذہب سے بیزار ہو کر اسلام کے مخالفین بر سر اقتدار نہ آجائیں، اور وہاں بھی فرانس کی طرح عقل پرستی کے ساتھ الحاد پرستی نہ شروع ہو جائے، اگر خدانخواستہ وہاں اسلام کا پرچم سرنگوں ہوا، تو اس کی تلافی ایک مدت مدید تک نہ ہو سکے گی، اور عام خیال ہو جائے گا، کہ اسلام زمانہ اور سیاست کا ساتھ نہیں دیسکتا،

.....

اسلام امن کا پیام لے کر آیا، اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے مبعوث ہوئے، مسلمانوں کی زندگی کا مقصد دنیا میں رحمت کی خوشخبری اور بشارت دے کر انسانیت کو سنوارنا تھا، وہ رگ باطل کے لیے نشتر تھے، مگر خود ان کی رگ باطل میں نشتر دینے کی ضرورت ہے، وہ شرار بولہبی کو مٹانے آئے تھے، مگر وہ خود شرار بولہبی سے مٹ رہے ہیں، وہ کفر پر ہنسنے آئے تھے، مگر کفر خود اُن پر خندہ زن ہے، اسلامی ممالک میں حکومت کے ساتھ اب دولت و ثروت کی فراوانی بھی ہے، مگر اس نعمت خداوندی کے باوجود کہیں ایسی اسلامی حمیت و غیرت اور باہمی موانست دیکھا نگت نہیں، جن پر دنیا کے مسلمان فخر کر سکیں، اُن کے بجائے وہاں یورپ کی ہر چیز سے شیفتگی، مذہب سے بیگانگی، الحاد سے وابستگی، دولت کے بیجا استعمال سے عیش پرستی، کردار شکنی، ضمیر فروشی، اور عزت و ناموس کی پامالی ہے کہیں ابولہب، کہیں عبد اللہ بن ابی، کہیں علقمی کہیں جعفر اور کہیں صادق کی روح کارفرما ہے، اور عام مسلمان اپنی زبان حال سے کہہ رہے ہیں،

ع :- کچھ بھی پیغام محمد کا ہمیں پاس نہیں

.....

مقالات

قاضی زادہ رومی مصنّف شرح چغمینی

احوال و آثار

از - جناب شبیر احمد خان غوری ایم اے ایل ایل بی - ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علیگڑھ

ماضی قریب میں (عملاً اور نام کے لیے آج بھی) عربی مدارس کے اعلیٰ نصاب میں معقولات کی جو کتابیں داخل درس رہی ہیں، اُن میں علم ہیئت کی مشہور کتاب "شرح چغمینی" بھی ہے، متاخر مغل بادشاہوں کے عہد میں تو ریاضی و ہیئت کے منتہی طلبہ "شروح تذکرہ" اور "تحریر المجسطی" بھی پڑھا کرتے تھے، معقولات کی یہ کتابیں علم و دانش کا خزانہ تھیں، جو اس زمانہ میں غدر در پڑھی جاتی تھیں[1]، برصغیر کی بڑی بڑی لائبریریوں میں ان کے مخطوطے کافی

---

[1] مثلاً اہتاب کے دھبوں کی توجیہ کے لیے محقق طوسی نے تذکرہ فی الہیئۃ" میں جو مفروضہ پیش کیا ہے ملا محمود جونپوری اُس پر اعتراض کرتے ہیں، "وما ذکرہ فی ... من وجود الاجرام الغیر القابلۃ للانارۃ بالتساوی فی تدویر القمر دیرد علیہ" (شمس بازغہ ص ۱۴۱)

اسی طرح اس لاینحل مسئلہ کے حل کے لئے کہ کواکب متحیرہ میں اُن کی تداویر کے مراکز ایک موہوم فلک (معدل المسیر) کا مرکز کے گرد کیوں حرکت کرتے ہیں متاخرین نے افلاک جزئیہ کی تعداد میں اضافہ کیا فاضل جونپوری نے اسکی تفصیل کے لیے شرح تذکرہ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، "وقد زاد المتاخرون فی الافلاک و اختلفوا فی تصویرھا من اراد الوقوف علیہ فلیرجع الی ..... (ایضاً ص ۱۴۴)

تعداد میں ملتے ہیں[1] جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور موخرالذکر (تحریر المجسطی) کی درسی حیثیت کا ثبوت[2] اس بات سے ملتا ہے، کہ مغل تاجدار محمد شاہ (۱۷۱۹ — ۱۷۴۸ء)

۱؎ "تذکرہ" کی قدیم ترین شرح قطب الدین شیرازی نے لکھی تھی، مگر ہندوستان کی کسی لائبریری میں اس کا پتہ نہیں چلتا، بعد کی شرحوں میں البتہ صرف ان چار فاضلوں کی شروح مشہور ہیں، نظام اعرج، میر سید شریف خفری اور برجندی کی شروح تذکرہ اور چاروں کے مخطوطے ہندوستان کی لائبریریوں میں عموماً ملتے ہیں، خلاصۃً آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "تذکرہ" کے متن کا ایک نسخہ ہے (ذخیرہ سبحان اللہ ۹؎) نظام اعرج کی شرح "توضیح التذکرہ" کے دو نسخے ہیں (سبحان اللہ ۱۰؎ عبدالحی ۶۶۴/۱۲) میر سید شریف کی شرح تذکرہ کے چار نسخے ہیں، (یونیورسٹی کلیکشن نمبر ۱۲، ۱۵ عبدالحی ۶۵۳/۳، ۶۶۲/۴۹) برجندی کی "شرح تذکرہ" کے دو نسخے ہیں، (سبحان اللہ ۹۰ عبدالحی ۶۵۴/۱۴) اور احمد خضری کی "التکملہ فی شرح التذکرہ" کے دو نسخے ہیں، (عبدالحی ۶۲۵/۵ عبدالسلام ...) رضا لائبریری رامپور میں نظام اعرج کی شرح کا ایک (فہرست کتب ۶ بی قدیم ص ۴۳) میر سید شریف کی شرح کے دو (۴۶، ۴۷) برجندی کی شرح کا ایک (ص ۴۵) خضری کی شرح کا ایک (ص ۴۴) اسی طرح اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ میں نظام اعرج کی شرح کے دو (ص ۲۴۴۷، ۲۴۴۸) میر سید شریف کی شرح کے دو (ص ۲۴۴۹، ۲۴۵۰) خضری کی شرح کا ایک (ص ۲۴۵۱) نسخہ ہے، اسی طرح کتب خانہ آصفیہ سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں برجندی کی شرح کا ایک نسخہ ہے (فہرست کتب صفحہ ۹۸، نمبر ۵۵) اور احمد خضری کے "التکملہ فی شرح التذکرہ" کا ایک نسخہ ہے، (فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد سوم ص ۳۲۶) اور لائبریریوں میں بھی ہونگے،

۲؎ "شمس بازغہ" فلسفہ کی کتاب ہے، لیکن مصنف علیہ الرحمہ نے اس کے "الفن الثانی فی السماء والعالم" کی دوسری فصل میں افلاک کی حرکات و ہیئات کا اجمالی بیان کر کے اس کی مزید تفصیل کے لیے المجسطی کا حوالہ دیا ہے،

"فثبت ان لکل مدۃ افلاک یتحرک کل حرکۃ متشابھۃ ویلزم من الاجتماع ذالک الاختلاف و تفصیل علی ما تیکفل بہ صناعۃ المجسطی"۔ شمس بازغہ ص ۱۳۲)

کے درباری طبیب معتمد الملوک علوی خاں (میر محمد ہاشم[1]) اور رصدگاہ محمد شاہی دہلی کے معاون سربراہ مرزا خیر اللہ مہندس[2] نے اس کتاب کی شرحیں لکھی تھیں، یہ اس دور کی باتیں ہیں، جب کہ ان علوم کو قوم بنظر اہتمام دیکھتی تھی، اور ان کے واقف کاروں کو سماج میں عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، مگر اب جب کہ ماضی سے نئی نسل کا رشتہ بھولی بسری داستان بنتا جارہا ہے، یہ نام اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہونے لگے ہیں، اس لیے اسلاف کی جگر کاویوں سے فی الجملہ واقفیت کے لیے ان کی علمی کاوشوں کا تذکرہ وقت کی اہم ضرورت ہے،

نظر بریں بقوائے مصرعہ مشہور:-

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

"شرح چغمینی" اور اس کے فاضل مصنف کا ایک مختصر تذکرہ پیش کیا جارہا ہے، وباللہ التوفیق

نام و نسب قاضی زادہ کا نام موسیٰ اور لقب صلاح الدین تھا، پدر بزرگوار کا نام محمد اور جد امجد کا محمود تھا، جو روم (ترکی) کے شہر بروصہ کے قاضی تھے، انھیں کی نسبت سے ہمارے رئیس التذکرہ "قاضی زادہ" کہلائے۔

خاندان قاضی زادہ کے مورث اعلیٰ قاضی محمود ترکی کے ایک غیر معروف مقام سلطان اولی میں پیدا ہوئے، دستور کے مطابق اپنے زمانہ کے علماء مشاہیر سے تفسیر، حدیث اور دوسرے

۱؎ میر محمد ہاشم کی "شرح تحریر المجسطی" (رضا لائبریری رامپور، فہرست کتب عربی قدیم فن ہیئت ص ۳۸)

۲؎ مرزا خیر اللہ مہندس کی شرح تحریر المجسطی "تقریب التحریر" کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں (فہرست کتب فارسی قدیم فن ہیئت) مرزا خیر اللہ نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر المجسطی کو نقل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو رضا لائبریری رامپور کی فہرست کتب عربی قدیم فن ہیئت ص ۳۱ "المجسطی" کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے

۳؎ کہ راجہ جے سنگھ سوائی کے ایما سے جس نے دہلی کی مشہور رصدگاہ جنتر منتر کو تعمیر کرایا تھا جگن ناتھ پنڈت نے "سمراٹ سدھانت" کے نام سے اس کتاب المجسطی کا سنسکرت میں ترجمہ کیا تھا،

علوم شرعیہ وادبیہ کو حاصل کیا، جلد ہی اُن کے علم وفضل کی شہرت پھیل گئی، جو اس زمانہ کے
عثمانی فرمانروا سلطان مراد اول (۷۶۱ - ۷۹۱ھ) کے کانوں تک بھی پہونچی اور اس نے
انھیں شہر بروصہ کا قاضی مقرر کر دیا، وہ متقی، پرہیزگار، عالم صالح، متشرع و متورع تھے،
عرصہ تک عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی اور دیانتداری سے پورا کرتے رہے،
اپنے علم وفضل اور نیکو سیرتی کی بنا پر عوام میں ہر دلعزیز تھے اور "قوجہ آفندی" کہلاتے تھے، خود
سلطان بایزید اُن کے علم وفضل، دین و دیانت اور حسن تدبر سے متاثر تھا، چنانچہ جب اس نے
اپنے بیٹے بایزید کی شادی امیر گرمیان (Germian) کی صاحبزادی سے کرنا چاہی
تو اس کے لیے وجوہ واعیان ملک کی ایک جماعت کو گرمیان بھیجا، تو اس جماعت کا
رئیس و پیشوا قاضی محمود ہی کو مقرر کیا[1]۔ یہ کوئی معمولی شادی نہیں تھی، بلکہ سیاسی مصالح بھی
اس میں کارفرما تھے، کیونکہ امیر گرمیان نے بیٹی کے جہیز کے نام سے کئی شہر بھی دیئے تھے،

قاضی محمود کے سال وفات کی کہیں صراحت نہیں ملتی۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادے
کا طاشکبری زادہ نے ذکر کیا ہے، ان کا نام محمد تھا، اور وہ بھی بڑے عالم و فاضل تھے، مگر ان کا
انتقال جوانی ہی میں ہو گیا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے[2]۔

لڑکا ہمارا رئیس التذکرہ ہے، جن کا نام موسیٰ پاشا تھا[3]۔

ولادت — قاضی زادہ کے سال ولادت کی تو کہیں تصریح ملتی نہیں، لیکن غالباً وہ آٹھویں صدی
کے ربع آخر کی ابتدا میں پیدا ہوئے (شاید ۷۶۰ھ کے قریب)

اوپر مراد اول کے جانشین بایزید کی امیر گرمیان کی صاحبزادی سے شادی کا ذکر

[1] الشقائق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ برحاشیہ تاریخ ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۶ - ۱۰
[2] ایضاً ص ۱۰، [3] ایضاً ص ۱۰

گذر چکا ہے، جس کی تکمیل کے لیے بادشاہ نے ہمارے رئیس التذکرہ کے دادا کو سربراہ
جماعت بنا کر بھیجا تھا، یہ شادی ۱۳۸۱ء (مطابق ۷۸۳ھ) میں ہوئی تھی، اور چونکہ طاشکبری
زادہ نے اس کا ذکر قاضی محمود کے بوڑھے ہو جانے کے ذکر کے فوراً بعد کیا ہے، اس لیے اندازہ
ہوتا ہے، کہ ۷۸۳ھ کے قریب وہ بوڑھے ہو چکے ہونگے، لہٰذا اُن کے صاحبزادہ محمد (اگر اُس وقت
حیات ہوں) جوان ہونگے اور چونکہ مولیٰ محمد کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا، اور انھوں نے
صرف دو ہی بچے چھوڑے تھے، اس لیے قاضی زادہ ۷۸۳ھ میں بچے ہونگے۔

بنا بریں اگر قاضی زادہ کا سال ولادت قرن ہشتم کی آخری چوتھائی کی ابتدا کے
قریب فرض کیا جائے تو غالباً یہ مفروضہ حقیقت سے زیادہ بعید نہ ہوگا۔

تعلیم — بدقسمتی سے تاریخ نے قاضی زادہ کی زندگی کی دوسری جزئیات کی طرح ان کے حصول
علم کی تفصیل یا اُن کے اس تذکرہ کے نام بھی محفوظ نہیں رکھے، طاشکبری زادہ نے صرف اتنا لکھا ہے
کہ انھوں نے پہلے اپنے وطن کے علماء سے تعلیم حاصل کی، پھر عجم (ایران) گئے، وہاں جا کر علمائے
خراسان سے پڑھا، اور آخر میں ماوراءالنہر جا کر مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی، اساتذہ میں میر
سید شریف کے سوا ان کے کسی اُستاد کے نام کا پتہ نہیں چلتا، اور ان سے بھی تلمذ برائے نام ہی تھا،
تفصیل آگے آرہی ہے،

بہرحال انھوں نے پہلے اپنے وطن ہی میں تعلیم حاصل کی۔

روم میں علم وادب کے مرکز کی تاسیس — دولت عثمانیہ، جس کی ۶۹۹ھ (مطابق ۱۱۹۰ء) میں سلطان
عثمان خان نے بنیاد ڈالی تھی، جلد ہی اپنے وقت کی عظیم سلطنت بن گئی، اور مغربی ایشیا کے
علاوہ مشرقی یورپ کے بڑے حصہ پر بھی ترکوں کی عظمت و شوکت کا پرچم لہرانے لگا، ۷۵۶ھ

[1] Encyclopaedia of Islam (Brill, Leyiden, 1936 vol. III, P 727

(مطابق ۱۴۵۳ء) میں سلطان محمد فاتح نے مشرقی رومن امپائر کے پایۂ تخت قسطنطنیہ کو
فتح کر لیا۔ جس نے دنیا، بالخصوص یورپ کی تاریخ کو ایک نئے رخ میں موڑ دیا، کیونکہ اسی فتح
سے تاریخ کے اُس دور کا آغاز ہوتا ہے، جو "نشاۃ ثانیہ" کہلاتا ہے۔ "باب عالی" کی جبہ سائی دول
یورپ کے سفراء کے لیے وجہ عز و افتخار بن گئی۔ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم نے مصر فتح کر کے
آخری عباسی خلیفہ سے منصب خلافت حاصل کر لیا۔ اس طرح ترک سلاطین کو دنیائے اسلام
میں اکثریت کی دینی سیادت بھی حاصل ہوگئی، اور یہ شرف انھیں آیندہ کوئی چار سو سال تک
حاصل رہا، تا آنکہ کمال اتاترک کی تجدد پرستی نے ۱۹۲۴ء میں نظام سلطنت کے ساتھ خلافت
کو بھی ختم کر دیا۔

ترکی کے اس عروج و زوال کی تفصیل سیاسی تاریخ کے مورخین کا منصب ہے،
لیکن ترکان احرار صرف تلوار ہی کے دھنی نہیں تھے، علم و ادب کی ترقی میں بھی انھوں نے
کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ روم کے پہلے سلطان (عثمان خان ۶۹۹-۷۲۶ھ) نے اس ملک کے
پہلے عالم (مولیٰ ادہ بالی) کی صاحبزادی سے عقد کیا،[1] اور اس طرح یہ بتا دیا کہ علماء و مشائخ
سلاطین و اُمراء کے ہم کفو و ہم مرتبہ ہیں، اُن کے جانشین سلطان اورخان (۷۲۶-۷۶۱ھ) نے
شہر ازنیق میں ترکی کا پہلا مدرسہ قائم کیا۔[2] سلطان محمد فاتح (۸۵۵-۸۸۶ھ) نے جب قسطنطنیہ
کو فتح کیا تو وہاں کے آٹھ بڑے گرجا گھروں کو مدارس میں تبدیل کر دیا۔[3] ان مدارس ثمانیہ
کی صدارت سب سے بڑا اعزاز سمجھی جاتی تھی، جس کا ایک ترک عالم تصور کر سکتا تھا،
سلطان محمد نے قسطنطنیہ کو فتح کیا، بے شک یہ ان کا بہت عظیم کارنامہ ہے، لیکن علم و حکمت
کی تاریخ میں اس سے بھی عظیم تر کارنامہ یہ ہے کہ ان کے ایماء سے مولیٰ خواجہ زادہ اور

۱؎ J.C.I.d.P. 458 ۲؎ الشقائق ص ۹ ۳؎ الشقائق ص ۸ ۴؎ الشقائق ص ۱۰۵

مولیٰ علاء الدین طوسی نے تہافت الفلاسفہ اور کتاب الذخیرۃ میں امام غزالی کے
"تہافت الفلاسفہ" اور ابن رشد کے "تہافت التہافت" یا متکلمین اور حکماء کے متصادم موقفوں
کے درمیان محاکمہ کیا۔[4] ترکی معاشرہ میں طبقۂ علماء کو جس غیر معمولی عزت و احترام
سے دیکھا جاتا تھا اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ سلطان بایزید کے وزیر اعظم ابراہیم
پاشا کے یہاں امیر الامراء احمد بیگ (جن سے بلند تر کوئی امیر نہیں بیٹھ سکتا تھا) سے بھی
بلند تر مقام پر مولیٰ لطفی توقانی بیٹھا کرتے تھے، حالانکہ مؤخر الذکر کا وظیفہ صرف
تیس درہم تھا۔[1]

ترک علماء کی علم دوستی اور ترک سلاطین کی علماء نوازی نے جو اسلام کی
ثقافتی تاریخ کا ایک روشن و درخشاں باب ہے، بغداد اور قاہرہ کی طرح قسطنطنیہ کو بھی
قبۃ الاسلام بنا دیا۔ مگر اس کی تفصیل کا استقصاء جس کی دلکشی

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پر عمل کرنے کی دعوت دیتی ہے، ہمیں موضوع بحث نظر سے دور لے جائے گی
جو صرف قاضی زادہ کے ضمن میں روم کے علمی ماحول کے بیان سے متعلق ہے،
روم (ترکی) میں اسلامی علوم و فنون کی طویل تاریخ پانچ ادوار میں
تقسیم کی جا سکتی ہے:-

پہلا دور:- سلطان عثمان خاں کے آغاز سلطنت سے مراد ثانی کی وفات
تک (۶۹۹-۸۵۵ھ)

دوسرا دور: محمد فاتح اور بایزید ثانی کا زمانہ (۸۵۵-۹۱۸ھ)

۱؎ الشقائق ص ۱۰۷ ۲؎ الشقائق صفحہ ۲۱۴

تیسرا دور: سلیم اول اور سلیمان اول کا زمانہ (۹۱۸-۹۷۴ھ)
چوتھا دور: سلیم ثانی کے عہد سے محمود ثانی کے زمانہ تک (۹۷۴-۱۲۵۵ھ)
پانچواں دور: عبدالمجید اول بالخصوص ان کے خط شریف "گلخانہ" کے اعلان کے بعد

ان میں دوسرا دور (بالخصوص محمد فاتح کا زمانہ) ترکی میں اسلامی علوم کی تاریخ کا عہد زریں ہے۔ روم میں اس زمانہ سے زیادہ علماء بے نحریر کی اتنی بڑی جماعت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ مثلاً مولیٰ خسرو بن فراموز (جنھیں سلطان اپنے زمانہ کا ابوحنیفہ کہا کرتا تھا[۱] اور جو فقہ میں "الغرر" اور اس کی شرح "الدرر" اور اصول فقہ میں "مرقاۃ الوصول" اور اس کی شرح "مرآۃ الاصول" کے مصنف ہیں) مولیٰ علاء الدین طوسی، مولیٰ خواجہ زادہ جنھوں نے تہافت الفلاسفہ اور تہافت التہافت کے مابین محاکمے لکھے[۲]، احمد بن موسی الخیالی جن کا شرح عقائد تفتازانی پر حاشیہ کچھ عرصہ پہلے تک عربی مدارس میں علم کلام کے اعلیٰ نصاب میں مقرر تھا، اور جس کے ذریعہ بلاد عجم میں طلبہ کی ذہانت کا امتحان لیا جاتا تھا[۳]، مصلح الدین قسطلانی، خطیب زادہ، علاء الدین عربی، مولیٰ عبدالکریم، حسن سامسونی، ابن الحاج حسن، علامہ قوشجی، مولیٰ مصنفک، سراج الدین حلبی، حمید الدین حسینی، صلاح الدین حسن چلپی، شمس الدین، خواجہ احمد وغیرھم۔

پہلا دور اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ اس عہد زریں کا پیش خیمہ ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ہمارے رئیس التذکرہ کی تعلیمی زندگی کا آغاز اسی دور میں ہوا۔ اس پہلے دور کی ابتدا سلطان عثمان خاں کے عہد حکومت سے ہوتی ہے۔

۱؎ الشقائق ص ۱۲۶، ۲؎ الشقائق ص ۱۰۷، ۳؎ الشقائق ص ۱۵۵-۱۵۶۔

اس سے پہلے اس علاقہ میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا جن لوگوں کو اس کا شوق ہوتا وہ باہر (شام مصر یا ایران میں) جاکر کسب کمال کرتے اور پھر وطن آکر اس فیض کو جاری کرتے۔ سلطان عثمان خاں کے عہد کے علماء میں سر فہرست مولیٰ ادہ بالی کا نام ہے جو قرامانیہ میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے اعلیٰ تعلیم (بالخصوص تفسیر، حدیث اور اصول) شام جاکر حاصل کی پھر وطن واپس آئے جہاں مسافروں کے لیے ایک زاویہ تعمیر کرایا سلطان عثمان خاں کے ساتھ ان کی صاحبزادی کے عقد ازدواج کا ذکر اوپر آچکا ہے اسی قران سعدین کے نتیجہ میں سلطان اورخان پیدا ہوئے سلطان ان سے نہ صرف مسائل شرعیہ ہی میں رجوع کیا کرتا اور سلطنت میں بھی مشورہ لیا کرتا تھا۔ ۷۲۶ھ میں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی[۱] شاگردوں میں مولیٰ طورسون زیادہ مشہور رہے جو ان کے داماد بھی تھے اور ان کی وفات پر ان کے جانشین بھی ہوئے[۲] اس عہد کے تیسرے مشہور عالم خطاب بن ابی القاسم تھے، وہ رہنے والے تو قرہ حصار کے تھے مگر اعلیٰ تعلیم انھوں نے وقت کے عام دستور کے مطابق شام جاکر حاصل کی جہاں سے تفسیر، حدیث اور فقہ میں تبحر حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے اور وفات تک درس و تدریس میں مشغول رہے تصانیف میں نسفی کے منظومہ خلافیات کی شرح یادگار رہی[۳]

سلطان عثمان خاں کے جانشین اورخان (۷۲۶-۷۶۱ھ) ہوئے ان کے عہد کے علماء میں مولیٰ داؤد قیصری، مولیٰ تاج الدین کردری اور مولیٰ علاء الدین اسود زیادہ مشہور رہے، اول الذکر بھی مولیٰ ادہ بالی کی طرح قرامانیہ ہی کے رہنے

۱؎ الشقائق ص ۶، ۲؎ الشقائق ص ۶، ۳؎ الشقائق ص ۶

والے تھے مگر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر تشریف لے گئے تھے جہاں تفسیر، حدیث اور اصول فقہ نیز علوم عقلیہ میں تبحر حاصل کیا، تصوف کے اسرار و دقائق بھی حاصل کیے۔ وطن واپس آئے تو سلطان اورخان نے شہر ازنیق میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور انھیں وہاں کا صدر مقرر کیا۔ طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:۔

وبنی السلطان اورخان مدرسة فی بلدة ازنیق وهی علی ما سمعته من الثقات اول مدرسة بنیت فی الدولة العثمانیة"[1]	سلطان اورخان نے شہر ازنیق میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور جیسا کہ میں نے ثقات سے سنا ہے، یہ پہلا مدرسہ ہے جو دولت عثمانی میں بنایا گیا۔

تصانیف میں شیخ ابن عربی کی "فصوص الحکم" پر ان کی شرح تصوف کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے۔ اس کے مقدمہ سے علوم منقولہ میں بھی ان کی دستگاہ عالی کا پتہ چلتا ہے۔

مولیٰ داؤد قیصری کی وفات پر سلطان نے مولیٰ تاج الدین کردری کو اس مدرسہ کا صدر مقرر کیا۔ وہ سراج الدین ارموی کے شاگرد تھے جو مطالع الانوار کے مصنف تھے۔ حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد ترکی آئے جہاں مولیٰ اوہ بالی نے اپنی دوسری صاحبزادی ان کے عقد میں دیدی۔[2]

مولیٰ تاج الدین کردری کی وفات پر سلطان نے اس مدرسہ کی صدارت مولیٰ علاء الدین اسود کو تفویض کی۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے بلاد عجم (ایران) گئے تھے۔ واپس آنے پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ دوران درس ہی میں فقہ کے مشہور متن "وقایہ" کی شرح لکھی۔ "وقایہ" کے علاوہ "المغنی" کی بھی شرح لکھی۔[3] شاگردوں میں مولیٰ

۱؎ الشقائق ص ۸ ۲؎ الشقائق ص ۹ ۳؎ الشقائق ص ۱۰

خلیل جندری زیادہ مشہور ہیں جنھیں اورخان نے قاضی لشکر مقرر کیا تھا۔ وہ ان کا غیر معمولی ادب و احترام کیا کرتا۔[1]

اسی عہد کے ایک اور قابل ذکر عالم مولیٰ محسن قیصری تھے۔ پہلے انھوں نے مولیٰ جلال الدین قیصری سے تعلیم حاصل کی پھر زمانہ کے دستور کے مطابق شام گئے جہاں تفسیر و حدیث میں کمال حاصل کیا۔ وطن واپس آکر درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری کیا اور فقہ اور فرائض میں دو منظومے لکھے نیز عروض کے ایک رسالہ کی شرح لکھی۔[2]

اورخان کے جانشین مراد اول (۷۶۱-۷۹۱ھ) کے عہد کے مشاہیر علما میں سر فہرست تو ہمارے رئیس التذکرہ کے جد امجد قاضی محمود ہیں جن کے علم و فضل اور دین و دیانت سے متاثر ہو کر سلطان نے بروصہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ تفصیلی تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔

دوسرے علما میں مولیٰ جمال الدین آقسرائی اور برہان الدین احمد مشہور ہیں:۔

مولیٰ جمال الدین آقسرائی امام رازی کی چوتھی پشت میں تھے۔ بلاد قرامان میں مدرسہ سلسلہ کے صدر تھے جس کی صدارت کے لیے "صحاح جوہری" کا حافظ ہونا شرط تھا۔ ان کے علم و فضل کے بارے میں طاشکبری زادہ نے لکھا ہے:۔

"عارفا بالعلوم العربیة والشرعیة والعقلیة قد درس فافاد و صنف فاجاد"[3]	علوم عربیہ و شرعیہ اور معقولات میں دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ بہت سے شاگردوں کو تعلیم دی اور مستفید کیا نیز بہت سی کتابیں بڑے اچھے انداز میں تصنیف کیں۔

۱؎ الشقائق ص ۱۱-۱۲ ۲؎ الشقائق ص ۱۲ ۳؎ الشقائق ص ۲۰

تصانیف میں "تفسیر کشاف" کا حاشیہ اور "الایضاح (فی المعانی)" نیز "انموذج (فی الطب)" کی شرح مشہور رہی، کثیر الافادہ مدرس تھے اور ان کے فیض تلمذ نے اکثر شاگردوں کو اپنے عہد کا باکمال عالم بنا دیا جیسا کہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے[1]

وانتفع بہ کثیر من الفضلاء ان سے بے شمار فضلاء اور علماء کی ایک جماعت
وتخرج عندہ جمع من العلماء[2] نے استفادہ کر کے کمال حاصل کیا

طلبہ کی کثرت کی وجہ سے انھیں تین جماعتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، مشائین جو ان کی سواری کے ہمراہ پڑھتے ہوئے چلتے تھے، رواقیین جو حجروں میں رہتے تھے اور وہ انھیں مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے تعلیم دیتے تھے اور اعلیٰ جو اندرون مدرسہ مقیم رہتے تھے، شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور مولی شمس الدین فناوی تھے[3] میر سید شریف بھی ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر ان سے پڑھنے پہونچے مگر ان کے پہونچنے سے پہلے ہی (آقسرائی) کا انتقال ہو چکا تھا، یہیں شمس الدین فناوی سے میر سید شریف کی ملاقات ہوئی[4]

مولی برہان الدین احمد از رنجان کے قاضی تھے، انھوں نے علامہ تفتازانی کی "التلویح علی التوضیح" پر "التصریح" کے نام سے حاشیہ لکھا تھا، جس نے جلد ہی علما میں قبول عام حاصل کر لیا[5]

سلطان مراد اول کو میدان جنگ میں ایک متعصب عیسائی نے دھوکے سے ہلاک کر دیا، ان کے جانشین سلطان بایزید (۷۹۱-۸۰۶) ہوئے جو اپنی شوکت

---

[1] الشقائق ص ۲۰ [2] الشقائق ص ۴۴ [3] الشقائق ص ۲۱ [4] الشقائق ص ۲۲

دابہت کی بنا پر "یلدرم" کہلاتے ہیں، ان کا عہد بھی علمائے نحاریر کے ظہور و نبوغ کے لیے مشہور ہے، ان میں گل سر سبد مولی شمس الدین فناوی تھے دوسرے مشہور علماء میں مولی حافظ الدین کردری الحاج پاشا اور محی الدین کافیجی تھے۔

مولی شمس الدین فناوی پہلے مولی علاء الدین اسود سے پڑھنے گئے مگر موافقت نہ ہو سکی، لہٰذا مولی جمال الدین آقسرائی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا، لیکن ابھی فاتحہ فراغ نہ پڑھنے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا، اسی زمانہ میں جیسا کہ ابھی مذکور ہوا میر سید شریف مولی جمال الدین کے علم و فضل کا شہرہ سن کر ان سے استفادے کی غرض سے آئے تھے، مگر ملاقات نہ ہو سکی، بہر حال مولی شمس الدین میر سید شریف کے ہمراہ مصر گئے، جہاں مولی اکمل الدین بابرتی سے فقہ اور مولانا محمد ابن مبارکشاہ منطقی سے معقولات پڑھی، بعدہ روم واپس آئے، جہاں سلطان نے انھیں شہر بروصہ کا قاضی مقرر کیا، بارگاہ سلطانی میں اتنا رسوخ تھا کہ عملاً وزیر تھے، قدرت نے دولت علم کے ساتھ ظاہری دولت و ثروت سے بھی نوازا تھا، ایک لاکھ پچاس ہزار دینار تو نقد ہی تھے، ایک بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا، جس میں دس ہزار جلدیں تھیں، تصانیف میں "فصول البدائع فی اصول الشرائع" سب سے زیادہ مشہور ہے، جسے "المنار" اصول بزدوی، "محصول امام رازی" اور "مختصر ابن حاجب" کی مدد سے مرتب کیا تھا، میر سید شریف کی "شرح المواقف" پر بھی مواخذات کیے تھے[1] شاگردوں میں دو بیٹوں مولی محمد شاہ اور مولی یوسف بالی کے علاوہ محی الدین کافیجی خاص

---

[1] الشقائق ص ۲۶

طور سے مشہور رہیں، مولی محمد شاہ فناوی شہر بروصہ کے مدرسۂ سلطانیہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے، ان کی وفات پر ان کے بھائی مولی یوسف بالی اس منصب پر فائز ہوئے[1]، محی الدین کافیجی جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں دستگاہ عالی رکھتے تھے[2]، وہ حافظ جلال الدین سیوطی کے استاد تھے، جو ان کے علم وفضل کی تعریف میں رطب اللسان ہیں،

مولی الحاج پاشا نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی "طوالع الانوار" کی شرح لکھی تھی، انھوں نے میر سید شریف سے پہلے قطب الدین رازی کی "شرح مطالع" پر حاشیہ لکھا تھا، جس پر بعد میں میر سید شریف نے مواخذات کیے تھے[3]۔

حافظ الدین کردری باہر سے آئے تھے، مقامی علماء میں مولی شمس الدین فناری سے مناظرہ ہوا اور لوگوں کو اندازہ ہوا کہ مولی فناری فروع میں اور وہ اصول میں ید طولی رکھتے ہیں، تصانیف میں "فتاوے بزازیہ" اور "مناقب امام ابی حنیفہ" مشہور رہیں[4]، موخر الذکر کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے،

لیکن باہر سے آنے والے علماء میں شیخ محمد ابن الجزری (۷۵۱-۸۳۳ھ) اور مجد الدین فیروزآبادی (۷۲۹-۸۱۷ھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جو اسلام کی ثقافتی تاریخ کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں، اول الذکر قرأت کے مستند عالم تھے[5]، اور ثانی الذکر لغت کے، جس کے اندر انھوں نے "محکم ابن سیدہ" اور "عباب صغانی" کی مدد سے "اللامع المعلم العجاب بین المحکم والعباب" ساٹھ جلدوں میں لکھی

[1] الشقائق ص ۳۶-۳۰، [2] ایضاً ص ۶۸، [3] ایضاً ص ۵۷، [4] الشقائق ص ۳۲ [5] الشقائق ص ۲۹

تھی، بعد میں اسے دو جلدوں میں مختصر کر کے "القاموس" کے نام سے شائع کیا، اس کے علاوہ قرآن کریم کی ایک تفسیر اور صحیح بخاری نیز "مشارق الانوار صغانی" کی شرح لکھیں[1]۔

اس عہد کے دیگر علماء مشاہیر میں شیخ بدر الدین محمد بن اسرائیل، شہاب الدین سیواسی (صاحب عیون التفاسیر) مولی علاء الدین اسود کے صاحبزادے حسن پاشا، مولی صقر شاہ، قطب الدین ازنیقی، بہاء الدین عمر، ابراہیم بن محمد حنفی، نجم الدین یار علی شیرازی، عبد الواحد، مولی علاء الدین رومی، شیخ رمضان، مولے احمدی ہیں،

مزید تفصیل غیر ضروری ہے، کیونکہ ہمیں صرف قاضی زادہ کے قیام وطن کے زمانہ ہی کے روم کے علمی ماحول کو بیان کرنا تھا جو ۷۹۰ھ کے بعد ختم ہو گیا، کیونکہ وہ اسی زمانہ میں حصول علم کے لئے باہر تشریف لے گئے اور پھر پردیسی ہو گئے۔

بہر حال یہ تھا روم کا علمی ماحول قاضی زادہ کے قیام وطن کے زمانہ میں، اور یہاں انھوں نے ابتدا میں تعلیم حاصل کی، جیسا کہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے، "وهو حصل فی بلاده بعضاً من العلوم"[2] انھوں نے اپنے وطن میں بعض علوم حاصل کیے

کیا پڑھا، کس سے پڑھا اور کب اور کہاں پڑھا؟ بدقسمتی سے تاریخ نے یہ تفصیلات محفوظ نہیں رکھیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، تحصیل علم کیلئے سفر اسلامی ثقافت کی غیر متبدل

[1] الشقائق ص ۳۳ [2] الشقائق ص ۷۱

روایت رہا ہے، پھر ایران میں علم و ادب کی جو نشاۃ ثانیہ ہو رہی تھی اس کی
شہرت تمام عالم اسلام میں پھیلی ہوئی تھی، قاضی زادہ نے بھی اس شہرت کو سنا
اور اس سے متاثر ہو کر ایران کے سفر کا عزم صمیم کر لیا، چنانچہ طاشکبری زادہ
لکھتے ہیں:۔

ولما سمع صیت العلوم فی بلاد العجم عزم ان یذھب الیھا لتحصیل العلم[1]	جب انھوں نے ایران کے اندر علم و حکمت کی شہرت سنی تو حصول علم کے لیے ایران جانے کا ارادہ کر لیا۔

مگر انھوں نے اس ارادے سے گھر والوں کو مطلع نہیں کیا، مبادا وہ انھیں
روک لیں، لیکن کسی طرح اس کی سن گن ان کی بہن کو مل گئی، یہ تو وہ جانتی تھی
کہ لیلائے علم کے اس دیوانہ کے پاؤں میں کسی کی محبت بھی زنجیر نہیں بن سکتی مگر
خواہرانہ جذبۂ محبت سے مجبور تھی، سب سے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ
کہیں سفر میں تنگدستی کا شکار نہ ہو جائیں، اس لیے چپکے سے ان کے سامان سفر میں
جو کتابوں پر مشتمل ہے اپنے زیورات رکھ دئے[2]

<u>ایران میں علم و ادب کی نشاۃ ثانیہ</u> | بغداد پر تاتاری سفاکوں کا حملہ اور اس کا
سقوط (۶۵۶ھ) اسلام کی سیاسی تاریخ کے ساتھ اس کی ثقافتی تاریخ کو بھی
دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، تاتاریوں کی جیرہ دستی سے قصر خلافت ہی منہدم
نہیں ہوا، عراق و خراسان میں بھی خون کی ندیاں بہہ گئیں، ستم رسیدوں میں اہل
سیف و اہل قلم کی کوئی تفریق نہ رہی، امرائے لشکر ہی تلوار کے گھاٹ نہیں اتارے گئے،

---

[1] الشقائق ص ۱۷ [2] الشقائق ص ۱۷

علماء و مشائخ پر بھی قیامت صغریٰ گذر گئی، شیخ سعدی نے یہ کہہ کر کوئی مبالغہ
آرائی نہیں کی تھی کہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین — بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

واقعہ یہ ہے کہ اس صدمہ سے مشرق وسطیٰ کی ثقافتی عظمت و رونق
ہی ختم ہو گئی۔

لیکن اس دین متین میں صرصر حوادث کے تھپیڑے کھا کھا کر بھی زندہ
رہنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے اور جلد ہی بقول اقبال

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ابھی ساتویں صدی ہجری ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دشمنان دین و ملت
کی اولاد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور آٹھویں صدی کے آغاز
میں ایلخانی تخت پر غازان (۶۹۴-۷۰۳ھ) کو متمکن پایا جو امیر نوروز کی ترغیب
سے مشرف باسلام ہو چکا تھا، اس کے بعد اس کا بھائی اولجائتو سلطان اور
موخر الذکر کی وفات پر اس کا بیٹا ابو سعید (۷۱۶-۷۳۶ھ) تخت نشین ہوئے،
اسلام کے اثر اور مسلمان وزراء کی صحبت نے تاتاریوں کی ثقافت
بیزاری کی بہت کچھ تعدیل کر دی تھی، خود دشمن اسلام ہلاکو نے محقق طوسی
کی تربیت کی اور ان کی سربراہی میں مراغہ کی رصد گاہ قائم کی، اس کے عہد
کے دیگر علماء میں قطب الدین شیرازی، نجم الدین دبیران قزوینی (مصنف
شمسیہ و حکمۃ العین) مؤید الدین عرضی دمشقی، فخر الدین مراغی، محی الدین اخلاطی،

---

[1] حبیب السیر - جلد سوم جزو اول صفحہ ۵۹

محی الدین مغربی وغیرہم تھے[1]۔ ہلاکو کے بیٹے اباقآن کا عہد حکومت مولانا روم، شیخ صدر الدین قونوی، اوحد الدین کرمانی وغیرہم کے ظہور و نبوغ کا زمانہ ہے[2]۔ اباقآن کے بعد احمد تکودار اور پھر ارغون بادشاہ ہوئے، ان کے زمانہ میں رضی الدین شاطبی، قاضی ناصر الدین بیضاوی (مصنف تفسیر انوار التنزیل، طوالع الانوار، منہاج الاصول) جمال الدین محمد بن سلیمان مقدسی، نجم الدین زرکوب مشاہیر فضلائے عہد میں سے تھے[3]۔

لیکن ایلخانی عہد میں اسلامی ثقافت کی تجدید و نشأۃ ثانیہ غازان نے کی، اس نے بہت سے مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرائیں اور رصدگاہ مراغہ کی مرمت کرائی[4]۔ اس کے جانشین اولجائتو سلطان نے بھی علمی سرپرستی کی روایات کو جاری رکھا، علم و حکمت کی نشر و اشاعت سے اسے یہ شغف تھا کہ اپنے ہمراہ سفر میں بھی ایک مدرسہ رکھا کرتا جو خیموں میں لگا کرتا تھا[5]۔ اس کے عہد کے مشاہیر علماء میں شیخ جمال الدین حلی، شیخ عبد الرحمن خراسانی، مولانا قطب الدین محمود، شہاب الدین عبد اللہ شیرازی (مصنف تاریخ وصاف) ابو سلیمان فخر الدین داؤد بناکتی (مصنف تاریخ بناکتی) محمد بن اسعد بن عبد اللہ الحنفی خاص طور سے قابل ذکر ہیں[6]۔

اولجائتو سلطان کے جانشین ابو سعید کا زمانہ قاضی عضد الدین ایجی کے لیے مشہور ہے، ان کا سلسلۂ تلمذ قاضی ناصر الدین بیضاوی کے توسط سے امام غزالی تک پہونچتا ہے[7]۔ حسب تصریح حمد اللہ مستوفی بعض لوگ انھیں قرن ہشتم کا مجدد، ملت

[1] حبیب السیر صفحہ ۶۱-۶۲ [2] حبیب السیر صفحہ ۶۶-۶۷ [3] حبیب السیر صفحہ ۷۷، ۸۰ [4] حبیب السیر جزء اول صفحہ ۱۰۷-۱۰۹ [5] حبیب السیر صفحہ ۱۱۲ [6] حبیب السیر صفحہ ۱۱۷-۱۱۸
[7] مرآۃ الجنان الجزء الرابع ص ۲۳۰

قرار دیتے ہیں[1]۔ خواجہ حافظ انھیں ابو اسحٰق (جو ابو سعید کے بعد شیراز کا بادشاہ ہو گیا تھا) کے دربار کے پانچ رتنوں میں سے ایک رتن بتاتے ہیں:۔

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف   بنائے کار "مواقف" بنام شاہ نہاد[2]

ہندوستان سے محمد تغلق نے مولانا معین الدین عمرانی کو شیراز بھیجا تھا کہ کسی طرح قاضی عضد کو ہندوستان لے آئیں[3]، مگر ابو اسحٰق نے قاضی عضد سے کہا کہ سوائے بیوی کے میرے پاس جو کچھ ہے آپ کے لیے حاضر ہے حتیٰ کہ تخت سلطنت بھی، مگر آپ یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، لہٰذا وہ وہیں رہ گئے[4]۔ انھوں نے "المواقف فی الکلام" کو بھی ابو اسحٰق ہی کے نام معنون کیا، حالانکہ محمد تغلق نے چاہا تھا کہ کم از کم وہ اس کتاب ہی کو اس کے نام معنون کر دیں[5]۔ تصانیف میں[6] "المواقف" کے علاوہ "عقائد عضدی" شرح مختصر ابن حاجب (اصول فقہ میں) اور "الفوائد الغیاثیہ" (بلاغت میں) مشہور ہیں۔ قاضی عضد نے ۷۵۶ھ میں وفات پائی۔ بے شمار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا مگر شہرت علامہ سعد الدین تفتازانی ہی کو نصیب ہوئی[7]۔ دوسرے مستفیدین میں قطب الدین رازی کا نام سر فہرست ہے[8]۔ ان کا سلسلۂ تلمذ بقول قاضی نور اللہ شوستری (مجالس المومنین میں) علامہ حلی کے توسط سے[9] اور بقول امام الدین ریاضی (تذکرہ باغستان میں) قطب الدین شیرازی کی وساطت سے محقق طوسی تک پہونچتا ہے[10]، جو پانچ واسطوں سے شیخ بو علی سینا کے شاگرد تھے[11]۔ قطب الدین رازی

[1] تاریخ گزیدہ ص ۸۰۰ [2] اخبار الاخیار ص ۱۵۰ [3] سبحۃ المرجان ص ۳۷ [4] شرح مواقف ص ۲۰ [5] شذرات الذہب جزء سادس ص ۳۲۱ [6] ایضاً ص ۱۸۶ [7] مجالس المومنین ص ۳۳۲ [8] تذکرہ باغستان ورق ۳۴۶ ب و ۳۴۲ الف [9] مجالس المومنین ص ۳۴۹

کے خاص شاگرد محمد ابن مبارکشاہ منطقی تھے، موخر الذکر کے شاگرد میر سید شریف جرجانی تھے۔[۱] میر سید شریف نے "المواقف" بھی انھیں سے پڑھی تھی۔[۲] اس طرح ان کی ذات میں فلسفہ وحکمت اور اشعری علم کلام دونوں کے سلسلے آکر مل گئے۔

ویسے شیعی علم کلام، تصوف، حکمت مشائیہ اور فلسفہ اشراق چاروں کے سلسلے محقق طوسی کے یہاں آکر مل چکے تھے[۳] حالانکہ ابن خلدون کا خیال ہے کہ فلسفہ اور کلام دونوں کے فکری دھارے سب سے پہلے قاضی ناصر الدین بیضاوی کے یہاں آکر ملے تھے۔[۴]

ابو اسحٰق کے قتل کے بعد فارس کی حکومت امیر مبارز الدین کے ہاتھ آئی، جس نے ۷۶۵ھ تک حکومت کی، اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع اس کا جانشین ہوا۔ شاہ شجاع زیور علم وادب سے آراستہ تھا، اور علما اور فضلا کا قدردان۔ اس کا دربار مجمع افاضل عصر بن گیا تھا، چنانچہ صاحب "روضۃ الصفا" لکھتے ہیں

"در مبادی حال و اوائل اشتغال بہ نیل کمالاتے کہ اذہان منتہیان از درک آں قاصر بودند، متصدی گشت و از ارتقای رود علوم سنیہ و معارف نفیسہ بدرجہ رسید کہ پیوستہ فضلائے دانشور و علمائے فضل گستر، مجلس ہمایون راہ می یافتند، از لطائف خاطر قدسی صفاتش محظوظ و بہرہ مند گشتہ زبان استحباب واستغراب می کشادند" (روضۃ الصفا جلد چہارم ص ۱۹۱)

ان علمائے فضل گستر میں اہم شخصیت مولانا قوام الدین عبداللہ فقیہ کی تھی،

[۱] الشقائق النعمانیہ ص ۱۶۷ [۲] الضوء اللامع: الجزء الخامس ص ۳۲۹ [۳] نذر روش تجرید محقق طوسی ص ۲۲-۲۵ [۴] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۹

جن سے بادشاہ نے قاضی عضد کی شرح مختصر ابن حاجب کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا،[۱]

مگر شاہ شجاع کے عہد کے علماء میں سب سے زیادہ قبول عام و بقائے دوام کا شرف قسام ازل نے میر سید شریف کو بخشا تھا۔ وہ مصر سے تعلیم مکمل کر کے (جہاں انھوں نے مولی شمس الدین فناری اور دیگر فضلائے روم کے ہمراہ نقلیات شیخ اکمل الدین بابرتی سے اور معقولات بالخصوص "شرح مطالع" و "شرح حکمۃ العین" مولانا محمد ابن مبارکشاہ منطقی سے پڑھے تھے) ۷۷۹ھ میں شیراز آئے اور پہلی ہی ملاقات میں بادشاہ کو متاثر کر کے علمائے عہد کے گل سر سبد بن گئے،[۲] مگر دس سال بعد جب ۷۸۹ھ میں تیمور نے شیراز پر حملہ کیا تو زر و جواہر اور دیگر نوادر کی طرح انھیں بھی سمرقند لے گیا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

آٹھویں صدی ہجری کا یہ ایران تھا جس کے اندر قاضی زادہ پہونچے اور علمائے خراسان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا،

فارتحل الی بلاد العجم و	پس وہ سفر کر کے ایران پہونچے اور
قرأ علی مشائخ خراسان[۳]	وہاں فضلائے خراسان کے آگے زانوئے
	تلمذ تہ کیا

مگر غالباً تیمور یہاں سے بھی دوسرے ممالک مفتوحہ کی طرح مختلف علوم و فنون کے باکمالوں کو اپنے پایۂ تخت لے گیا تھا، اور اس لیئے قاضی زادہ کو کوئی ایسا فاضل استاد نہ مل سکا جو ان کی علمی تشنگی کو آسودہ کر سکتا، اس لیے اب وہ ماوراء النہر کے لیے روانہ ہوئے، جہاں تیمور نے اقطاع عالم کے باکمالوں کو جمع کر رکھا تھا۔ (باقی)

[۱] حبیب السیر جلد سوم جزء دوم ص ۳۱ [۲] حبیب السیر جلد سوم جزء سوم ص ۹۸ [۳] الشقائق ص ۱۷

امیر خسروؒ اور افضل الفوائد

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

افضل الفوائد میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی زبانی ان کے مرشد سے متعلق جو بعض باتیں ہیں وہ ان ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں، یہ اور دوسرے ملفوظات میں نہیں ملیں گی، مثلاً

ایک موقع پر فرمایا کہ ایک بار شیخ الاسلام فریدالحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز بیٹھے تھے کہ سات درویش آئے، ان میں ہر ایک کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا، ان کے سامنے میوہ کے ساتھ کھانا رکھا گیا، ہر ایک نے اقرار کیا کہ ہم لوگ بیس سال سے ایک مرد خدا کی طلب کر رہے تھے، کسی کو نہیں پایا، مگر خواجہ جی کو پالیا (ص ۱۶)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ شیخ الاسلام فریدالحق والدین کو انگور بہت پسند تھا، ایک بار حالت تفکر میں تھے کہ نفس کا تقاضا ہوا کہ انگور کھالیں، اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک میں زندہ ہوں، اپنے نفس کی اس آرزو کو پورا نہ کروں گا، مولانا بدرالدین شیخ الاسلام کی صحبت میں رات دن رہتے تھے،

انھوں نے بھی قسم کھائی کہ شیخ کی زندگی میں انگور نہ کھائیں گے، یہاں تک کہ وہ اپنے نفس پر غالب آجائیں (ص ۱۹۸)

ایک مجلس کے ذکر میں ہے کہ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے فرمایا کہ شیخ الاسلام فریدالحق والدین کا معمول تھا کہ جب وہ عالم تحیر میں ہوتے تو ایک روز میں ہزار سجدے کرتے، پھر اٹھتے، یہاں تک کہ ان کی چشم مبارک سے خون رواں ہوجاتا، اس وقت عالم صحو میں آتے (ص ۹۹)

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ مولانا بدرالدین اسحٰق نے بتایا کہ وہ ایک بار شیخ الاسلام فریدالحق والدین کے ساتھ سفر میں تھے، وہ ایک دریا کے کنارے پہونچے، وہاں کوئی کشتی نہ تھی، شیخ الاسلام نے میری طرف نظر کی اور بولے کہ میرے اور اپنے جوتے ہاتھ میں لو اور آؤ، پانی کے اندر داخل ہوجاؤ، اپنی آنکھوں کو سامنے رکھو، میں نے ایسا ہی کیا، مجھ پر ایسی وحشت طاری تھی کہ میں کچھ بول نہیں سکتا تھا، ہم لوگ اپنی منزل پر پہونچ گئے، تو میں نے پوچھا یہ کیسے ہوا، فرمایا کہ سورہ مزمل پڑھ کر پانی پر پھونک دیا، پھر اس کے اندر راہ مل گئی (ص ۱۴۵)

نفل نمازوں کی برکتیں تو بہت ہی جزوی تفصیلات کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے شیخ الاسلام فریدالحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز سے سنا کہ جو شخص ہر مہینہ یہ نماز پڑھے تو اس کا درجہ بہشت میں اعلیٰ ہو، وہ نماز یہ ہے کہ چار رکعت کی نماز ایک سلام میں پڑھے، ہر رکعت میں الحمدللہ ایک بار پھر جو سورہ یاد ہو پڑھے، پھر اٹھارہ بار سبحان اللہ الذین

بار سبحان ربی العظیم اور دس بار سبحان اللہ کہہ کر سر اٹھائے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہے، دس بار سبحان اللہ اور الحمد للہ آخر تک کہے، حالت قومہ اور تحیت سجود میں دس بار سبحان اللہ کہے، اس کے بعد سجدہ میں جائے سبحان ربی الاعلیٰ تین بار اور دس بار سبحان اللہ پڑھے، پہلے سجدہ سے سر اٹھائے تو گیارہ بار سبحان اللہ کہے، دوسرے سجدہ میں اسی طرح دس بار سبحان اللہ کہے، اسی ترتیب کے ساتھ پوری نماز ادا کرے (ص ۲۱)

افضل الفوائد میں جس وضاحت اور جزوی تفصیلات کے ساتھ حضرت فرید الدین گنج شکر کی رحلت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ کسی اور مجموعۂ ملفوظات میں نہیں، ناظرین ملاحظہ کریں۔

ایک سال ۵ محرم کو خواجہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین کا عرس تھا، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا برہان الدین غریب، شیخ عثمان سیاح، شیخ حسین نبیرۂ شیخ قطب الدین بختیار اوشی، مولانا زرادی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا نصیر الدین کتابی، حسن علا سجزی اور دوسرے عزیز خدمت میں حاضر تھے، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے شیخ فرید کی بزرگی اور اخلاق پسندیدہ کی باتیں شروع کیں تو رونے لگے، تمام حاضرین پر بھی اثر پڑا، اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے فرمایا کہ حضرت خواجہ فرید نے ۵ محرم کو وفات پائی جس رات کو خواجہ کبیر کی رحلت ہوئی، بندہ کو یہ کہہ کر یاد کیا کہ مولانا نظام الدین نہیں ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ جب ان کی وفات کی ساعت قریب آئی تو وہ اٹھے، کھڑے ہوئے صبح سے چاشت تک پانچ بار قرآن

ختم کیا، اس کے بعد ذکر میں مشغول ہوئے، اتنا ذکر کیا کہ جسم سے خون رواں ہو گیا، جو قطرہ زمین پر گرتا اس سے اللہ کا نقش ظاہر ہوتا، یہ رباعی پڑھ کر سجدہ کیا اور پھر سر اٹھا لیا،

بوئے خوش تو ز پیرہن می شنوم — شرح غم تو ز خویشتن می شنوم
گر ہیچ نباشد کہ کسے بہ نشانم — تا نام تو می گوید و من می شنوم

اس کے بعد ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، لوگ شیخ کے گرد جمع ہوئے تو ان کی طرف مخاطب کر کے کہا کہ وہ سب باہر بیٹھ جائیں، جب میں بلاؤں تو آئیں، سب باہر بیٹھ گئے، کچھ دیر کے بعد آواز آئی کہ یہی وقت ہے کہ دوست دوست سے ملے، یہ سن کر سب اندر چلے آئے، تو خواجہ کو دیکھا کہ وہ کسی اور ہی عالم میں ہیں، عشا کی نماز کا وقت ہوا تو چار بار نماز پڑھی، اس کے بعد سر بسجود ہو گئے اور اپنی روح حق کے حوالے کر دی پھر آواز بلند ہوئی، جو وہاں کے تمام لوگوں نے سنی کہ ایک امانت روئے زمین پر تھی، اب وہی امانت خدا کے سپرد ہو گئی، جب یہ باتیں ختم کیں تو پوری مجلس سے ہائے کا نعرہ بلند ہوا، اور ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کسی وقت ایسی نہیں ہوئی تھی (ص ۱۲۲ - ۱۲۱)

اعتراض تھا کہ افضل الفوائد میں وضاحت اور جزوی تفصیلات کے ساتھ باتیں نہیں کہی گئی ہیں، اور یہ حضرت فرید گنج شکرؒ کی رحلت وضاحت اور جزوی تفصیلات سے بیان کی گئی ہے تو اعتراض ہے کہ اس میں بعض باتوں کے الحاقی ہونے کا شبہ ہے، کیونکہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنی ان مجلسوں میں بیان نہیں کیں، جو ملفوظات کی دوسری کتابوں میں

ملتی ہیں۔ (ص ۸۷)

اور اگر اس کی نشاندہی کر دی جائے کہ فوائد الفواد میں بھی ایسی باتیں ہیں جو دوسروں کی نظروں میں مبالغہ آمیز معلوم ہوں تو کیا افضل الفوائد کو مستند تسلیم کر لیا جائے گا، پھر فوائد الفواد سے ایسی کچھ باتوں کی مثالیں یہ ہیں:۔

فرمایا کہ قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کعبۂ مبارک کا طواف کر رہے تھے تو انھوں نے ایک بزرگ کو طواف میں دیکھا وہ ان کے پیچھے ہو گئے جہاں وہ قدم رکھتے تھے تو اسی جگہ وہ بھی اپنا قدم رکھتے تھے، ان پیر روشن ضمیر یعنی بزرگ نے یہ دیکھ کر کہا کہ میری ظاہری متابعت کرتے ہو میری وہ متابعت کرو جو میں کرتا ہوں، قاضی حمید الدین علیہ الرحمۃ نے پوچھا آپ کیا کرتے ہیں، پیر صاحب نے فرمایا کہ میں ہر روز سات سو بار قرآن ختم کرتا ہوں، قاضی حمید الدین کو سخت تعجب ہوا اور وہ سوچنے لگے کہ قرآن کے معانی کو خیال میں لاتے ہوں گے اور خیال ہی میں پڑھتے ہوں گے، لیکن پیر صاحب نے کہا لفظ بلفظ پڑھتا ہوں، خیال میں نہیں پڑھتا ہوں، جب خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے یہ حکایت ختم کی تو اعز الدین علی شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ جو خاص مریدوں میں ایک تھے، وہاں موجود تھے انھوں نے کہا یہ تو کرامت ہی ہے، خواجہ نے فرمایا کہ ہاں کرامت ہے، جو معاملہ عقل میں نہ آئے وہ کرامت ہی ہوتی ہے (فوائد الفواد ص ۹)

فرمایا ایک بادشاہ بہت ہی صلاحیت والا اور صاحب کشف تھا، اپنے تخت پر بیٹھا تھا اس کی نظر اپنے اصطبل کی طرف بھی جاتی تھی، اس کی ملکہ بھی

اس کے پہلو میں تخت پر بیٹھی تھی اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور دیر تک اس کی طرف آنکھ لگائے رکھی پھر اپنے اصطبل کی طرف دیکھا، پھر اندر کی طرف نظر کی، دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا، اس کے بعد اپنی ملکہ کو دیکھا اور رونے لگا، ملکہ نے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ آپ نے دیر تک آسمان کو دیکھا، پھر اصطبل کی طرف نظر کی اور پھر آسمان کو دیکھا، پھر میری جانب دیکھ کر رونے لگے؟ بادشاہ نے کہا کہ اس سوال کو چھوڑ دو یہ کہنے کے لائق نہیں ہے، ملکہ نے اصرار کیا کہ ضرور بتائیے، بادشاہ نے کہا اب تم اصرار کرتی ہو تو کہتا ہوں، اس کے بعد بولا کہ لو سنو اس وقت میری نظر لوح محفوظ پر گئی، دیکھتا ہوں کہ میرا نام زندوں کی فہرست سے نکال دیا گیا ہے، میں سمجھ گیا کہ میرے جانے کا وقت آگیا، دوسری بار دیکھا اور خیال آیا کہ میری جگہ کون ہوگا تو ایک حبشی نظر آیا جو اس اصطبل میں ہے، وہ میری جگہ ہوگا اور تو اس کے نکاح میں آئے گی (فوائد الفواد ص ۲۸۳-۲۸۲) اور یہی ہوا۔

فرمایا کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنی کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ ایک جوان تھا اسے قزوینی کہتے تھے، اس کے گھر میں مردانِ غیب جمع ہوا کرتے تھے، نماز کے وقت لوگ صف در صف کھڑے ہوتے، مردان غیب میں ایک شخص امامت کرتا، جماعت بلند قرأت، تسبیحات اور جو کچھ نماز میں ہوتا سنتی، لیکن اسے نہ دیکھتی، بس وہ قزوینی ہی دیکھتا، شیخ شہاب الدین نے فرمایا کہ ان ہی مردان غیب میں ایک نے قزوینی کے ہاتھ ایک مہرہ میرے پاس بھیجا تھا اور وہ مہرہ ابھی تک میرے پاس ہے ...... اس کے بعد فرمایا کہ مردان غیب

پہلے آواز دیتے ہیں، اور اپنی آواز سناتے ہیں اس کے بعد ملاقات کرتے ہیں، پھر اڑ جاتے ہیں، آخر میں زبان مبارک سے فرمایا کہ یہ راحت کا کیسا مقام ہے جہاں وہ کسی کو لے جاتے ہیں' (ص ۱۰۵)

فوائد الفواد میں جو یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ سورہ یٰسین پڑھ کر امام ناصری مر کر اور دفن ہو جانے کے بعد قبر سے باہر زندہ نکل آئے اس کی تفصیل تو افضل الفوائد کی روایتوں سے زیادہ حیرت انگیز ہے (ص ۶۰)

ایک اعتراض یہ ہے کہ افضل الفوائد میں بہت سے مضامین وہ ہیں جو دوسری کتابوں میں تقریباً اسی انداز سے بیان ہوئے ہیں (ص ۴۸) لیکن اس سے پہلے یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ افضل الفوائد اور فوائد الفواد دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق نظر آئے گا (ص ۴۲) یعنی افضل الفوائد میں وہ باتیں نہیں ہیں جو فوائد الفواد میں ہیں، اور پھر یہ بھی کہ وہی باتیں دہرا دی گئی ہیں، اس دلیل کی تائید میں فوائد الفواد سے دو مثالیں دی گئی ہیں، ایک تو شمس الدین التمش کی سیرت سے متعلق ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور اس میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ اگر اس روایت کی عبارت فوائد الفواد سے سرقہ کی جاتی تو اس کے الفاظ بالکل ملتے جلتے ہوتے دوسری روایت خواجہ بایزید بسطامیؒ سے متعلق ہے، ہم یہاں پر افضل الفوائد اور فوائد الفواد دونوں کی عبارتیں نقل کرتے ہیں،

افضل الفوائد	فوائد الفواد
ہم دریں محل این حکایت فرمود کہ	آن گاہ ہم از نسبت صدق و دیانت

افضل الفوائد	فوائد الفواد
جہودے دیگر ہمسایہ خواجہ بایزید بود اورا گفتند کہ مسلمان چرا نمی شوی او جواب داد کہ اگر مسلمانی انیست کہ بایزید می کند من نمی توانم کرد و اگر انیست کہ شما می کنید ازین ننگ دارم (ص ۲۹)	در اسلام و اسلامیان حکایت فرمود کہ جہودی در جوار خانہ بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز خانہ داشت، چون خواجہ بایزید نقل کرد آن جہود را گفتند کہ تو چرا مسلمان نمی شوی؟ جہود گفت چہ مسلمان شوم اگر اسلام آنست کہ بایزید دانست آن اسلام از من نیاید و اگر انیست کہ شما دارید مرا ازیں اسلام عار می آید (ص ۳۰۸)

یہ روایت جیسا کہ معترض کا بھی بیان ہے کہ خواجہ فریدالدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیا میں اس طرح ہے:

"گبرے را گفتند کہ مسلمان شو گفت اگر مسلمانی است کہ بایزید می کند من طاقت ندارم، نتوانم کرد و اگر انیست کہ شما می کنید بدین ہیچ اعتبار ندارم"

اگر کوئی عیب جو ناقد یہ کہے کہ فوائد الفواد کی روایت بھی جعلی ہے، کیونکہ تذکرۃ الاولیا کی روایت کچھ اور رہی ہے تو کیا یہ تسلیم کر لیا جائے گا؟ پھر فوائد الفواد اور افضل الفوائد میں مذکورۂ بالا روایت کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی کیا جائے کہ دونوں میں یہ روایت کس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے تو فوائد الفواد سے یہ روایت مستعار لینے کا شبہہ ہی نہیں پیدا ہو گا، فوائد الفواد میں یہ بات حضرت

عمرؓ کے زمانہ کے عراق کے ایک "بادشاہ" کی فراست اور دانائی کے ذکر کے بعد کی گئی ہے، لیکن افضل الفوائد میں یہ روایت حقوق ہمسایہ میں بیان کی گئی ہے، اگر یہ وضاحت اور جزوی تفصیلات ناظرین کے لیے گراں نہ ہوں تو اس کا سیاق و سباق ملاحظہ ہو۔

حقوق ہمسایہ پر گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ کو ہمسایہ سے متعلق اتنی نصیحتیں کیں کہ گمان ہونے لگا کہ کہیں ہمسایہ کو مال میں بھی وراثت کا حق نہ ہو جائے، اس کے بعد حضرت خواجہ نے فرمایا کہ تذکرۃ الاولیا میں لکھا ہوا دیکھا کہ حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کے ہمسایہ میں ایک یہودی رہتا تھا، وہ کسی سفر پر چلا گیا، اس کی بیوی کو حمل تھا، بچہ پیدا ہوا تو اس عورت کے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ اس سے اپنا چراغ جلائے، بچہ تاریکی میں رویا کرتا تھا، جب یہ خبر حضرت بایزید بسطامیؒ کو ہوئی تو وہ ہر رات دوکان سے تیل لا کر اس یہودی عورت کو دیتے، جب وہ یہودی سفر سے واپس آیا تو اس کی بیوی نے یہ تمام کیفیت بیان کی، وہ یہودی شرمندہ ہوا، حضرت بایزید کی خدمت میں پہنچا اور پوچھا کہ آپ نے اتنا لطف و کرم کیوں کیا؟ جواب دیا کہ ہمسایگی کے سبب سے کیونکہ ہمسایہ کا حق بہت بڑا ہے، اس کے بعد وہ یہودی مسلمان ہو گیا، اسی کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے یہ حکایت بیان کی کہ خواجہ بایزید کا ایک دوسرا یہودی بھی ہمسایہ تھا، اس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں نہیں مسلمان ہوتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ اگر مسلمانی

وہی ہے جس پر بایزید عمل کرتے ہیں، تو میں اس پر عمل نہیں کر سکتا ہوں، اور اگر مسلمانی وہ ہے جو تم کرتے ہو تو اس سے شرم آتی ہے۔"

اگر ذہن صاف ہو تو پھر افضل الفوائد میں جس سلسلہ میں یہ روایت بیان کی گئی ہے اس سے یہ شبہہ نہیں پیدا ہوتا ہے کہ یہ فوائد الفواد سے لی گئی ہے، خصوصاً جب تذکرۃ الاولیا کا حوالہ صاف طور پر موجود ہے۔

اسی طرح یہ اعتراض ہے کہ افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مرتبہ مولانا کیتھلی میرے پاس آئے، کھانا موجود تھا، مبشر کو کہا کہ لاؤ، اس نے لانے میں دیر کر دی، میرے پاس ایک چھوٹی چھڑی تھی، اس کی پیٹھ پر ماری، مولانا کیتھلی نے اس طرح آہ کی گویا انہیں کی پیٹھ پر لگی ہے، میں نے پوچھا آپ نے آہ کیوں بھری، فوراً پیٹھ سے کرتا اتار کر مجھے دکھایا، جب میں نے نگاہ کی تو اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود تھا، یہ واقعہ سیر الاولیا وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے۔"

(ص ۴۸)

میرے سامنے افضل الفوائد کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا، مگر فوائد الفواد (۱۱۳) اور سیر الاولیا (ص ۵۳۷) میں یہ ملفوظات ہیں، سیر الاولیا کی روایت تو فوائد الفواد ہی سے تقریباً لفظ بہ لفظ مستعار ہے مگر افضل الفوائد میں جو روایت بیان کی گئی ہے، وہ کچھ مختلف ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ مبشر میرا خدمت گار ابھی بچہ ہی تھا، اس نے بے ادبی کی تو اس کو ایک چھڑی ماری گئی، مولانا کیتھلی نے ایسے درد کا اظہار کیا کہ تم کہو گے کہ وہ چھڑی ان ہی کو ماری گئی، وہ رونے لگے اور بولے کہ میری

شومیت کی وجہ سے یہ الفنا کی ہوئی۔ فوائد الفواد کی روایت میں یہ نہیں ہے
کہ میں نے پوچھا آپ نے آہ کیوں بھری؟ فوراً پیٹھ سے کرتا اٹھا کر مجھے
دکھایا، جب میں نے نگاہ کی تو دیکھا اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود
تھا، اتنا ٹکڑا سیر الاولیاء میں بھی نہیں ہے، اگر یہ ملفوظات فوائد الفواد اور
سیر الاولیاء سے سرقہ کیے گئے ہیں تو اتنے ٹکڑے کو کس مصلحت سے بڑھایا گیا
کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت خواجہ نے اپنی مجلس میں اس واقعہ کو اس
طرح دہرایا جس طرح کہ افضل الفوائد میں منقول ہے؟ پھر سیر الاولیاء
اور فوائد الفواد کی عبارتوں میں بھی کچھ تھوڑا سا فرق ہے، فوائد الفواد
میں ہے۔

"بیشتر کہ خدمتگار منست ہنوز طفل بود مگر او بے ادبی کرد"

سیر الاولیاء میں ہے۔

بیشتر خدمتگاران پیش من جمع شدہ بودند یکے ازان بے ادبی کرد"

دونوں عبارتوں میں جو تھوڑا اختلاف ہے اس کے متعلق ایک خردہ
گیر ناقد کی کیا رائے ہو سکتی ہے،

افضل الفوائد اور فوائد الفواد کی ملی جلی روایت کی ایک مثال کی اور
نشاندہی کی گئی ہے، دونوں عبارتیں ملاحظہ ہوں،

فوائد الفواد	افضل الفوائد
حلائم این سخن حکایت فرمود کہ در آنچہ خروج کفار تتار شد	بعد ازان فرمود کہ شنیدہ ام از زبان شیخ الاسلام فریدالحق والدین

چوں بلائے مغل بہ نیشاپور رسید بادشاہی کہ آنجا بود کس بر شیخ فریدالدین عطار فرستاد قدس اللہ سرہ العزیز کہ دعائے بکن! او جواب گفت کہ وقت دعا گذشت، وقت رضا است یعنی بلائے خدا نازل شد تن برضا باید داد، بعد ازاں فرمود کہ بعد از نزول بلا ہم دعا باید کرد، اگرچہ بلا دفع نشود اما صعوبت بلا کم شود (ص ۸۹)	قدس اللہ سرہ العزیز کہ وقتے در نیشاپور مغل در آمد و جملہ نیشاپور را گرد گرفت خلیفہ آن شہر کس را نزد خواجہ فریدالدین عطار فرستاد و گفت بروید و بگوئید کہ دعا کنید، خواجہ فرمود کہ کار دعا گذشت بلائے خدا را ساختہ باید تقدیم این ست، دعائے تقدیر را بدل نتوانم کرد، پس رضا باشد بہرچہ تقدیر است خدائے را (ص ۹۱)

سیر الاولیاء میں بھی یہ ملفوظات ہیں جو اس طرح درج ہیں۔

"ملائم این حکایت فرمود چوں خدائے بلائے مغل نیشاپور رسید
حاکم آنجا کس بر شیخ فریدالدین عطار فرستاد کہ دعا بکن او جواب
گفت وقت دعا گذشت، کنوں وقت رضا است، بعد ازان فرمود
کہ بعد نزول بلا ہم دعا باید خواند، اگرچہ بلا دفع نشود اما صعوبت
بلا کم شود، و بعدہ فرمود چوں بلا نازل شد باید کہ ازان بلا
ہیچ کراہیت نداردہ (ص ۴۴۳)

ان تینوں کتابوں میں جو یہ ملفوظات نقل کیے گئے، ان کے سیاق و سباق
کا بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے، افضل الفوائد میں یہ ملفوظات اس گفتگو کے

موقع کے ہیں جب مجلس میں اس کا ذکر تھا کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ بدلا نہیں
جا سکتا، فوائد الفواد میں یہ ملفوظات اس موقع کے ہیں جب یہ ذکر تھا کہ
نزول بلا سے پہلے کی دعا قبول ہوتی ہے، سیر الاولیا میں یہ ملفوظات ادعیہ
ماثورہ کے بیان کے سلسلہ میں درج ہیں پھر سیر الاولیا اور فوائد الفواد کے کچھ
الفاظ تو مشترک ہیں، مگر افضل الفوائد کے ملفوظات معنًا تو یکساں ہیں، لیکن
لفظًا مختلف ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ یہ عبارتیں فوائد الفواد یا سیر الاولیا
سے سرقہ نہیں کی گئی ہیں، پھر افضل الفوائد میں خلیفہ، فوائد الفواد میں بادشاہ
اور سیر الاولیا میں حاکم کیوں درج ہے، اس اختلاف کی وجہ کیا بتائی جا سکتی
ہے. کیا یہ دلیل قابل قبول ہو سکتی ہے کہ اس روایت کو بیان کرتے وقت خود حضرت
خواجہ کی زبان مبارک سے مختلف مجلسوں میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا۔

افضل الفوائد اور فوائد الفواد دونوں میں شیخ فرید الدین عطارؒ کی
تذکرۃ الاولیا سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، ان ہی میں افضل الفوائد کی ایک روایت
کا اردو ترجمہ منادی کے امیر خسرو نمبر کے ص ۸۶ پر درج ہے، جس کا فارسی
متن یہ ہے۔

"بعد ازاں سخن در برکت یافتن خواجہ حسن بصری حکایت فرمود کہ
خواجہ حسن طفل بود، روزے در کوزہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آب بخورد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پرسید کہ ازیں کوزہ آب کہ خورد،
گفتند حسن، چنانچہ ازیں کوزہ آب بخورد علم بدو سرایت کند (افضل
الفوائد قلمی نسخہ ص ۱۲۴)

یہ روایت تذکرۃ الاولیا میں اس طرح درج ہے۔

"نقل است کہ حسن طفل بود یک روز از کوزہ پیغامبر علیہ السلام
آب خورد در خانۂ ام سلمہؓ پیغامبر گفت علیہ السلام این آب کہ
خورد گفت حسن گفت چندانکہ ازیں آب خورد علم من بدو سرایت کند (ص
۲۴)"

افضل الفوائد اور تذکرۃ الاولیا کی روایتیں معنًا ایک ہیں، مگر لفظًا
ایک نہیں ہیں، جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرۃ الاولیا سے نقل نہیں کر لی گئی
ہیں بلکہ یہ زبانی دہرائی گئیں جو اسی طرح قلمبند کر لی گئیں،

افضل الفوائد میں یہ بھی روایت بیان کی گئی ہے کہ

"مادر خواجہ حسن بصری از موالی حضرت ام سلمہؓ بود چوں مادرش
بہ مشغول شدی خواجہ حسن بگریستی کہ ہنوز شیر نمی خوردہ ام سلمہؓ
پستان شریفہ خود در دہان او نہادی تا بمکیدی و قطرہ شیر
پدید آمدی، بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بر لفظ مبارک راند
کہ چوں ہزار برکت کہ حق تعالیٰ در وی پدید آورد و آں از
برکت او بود (ص ۱۲۴)

تذکرۃ الاولیا میں یہ روایت اس طرح درج ہے۔

"مادر او از موالی ام سلمہؓ بود، چوں مادرش بہ کاری مشغول
شدی، حسن در گریہ آمدی، ام سلمہ رضی اللہ عنہا پستان خود در
دہانش نہادی تا او بمکیدی، قطرۂ چند شیری پدید آمدی، چندان

ہزار برکات کہ حق از و پدید آورد ہمہ از اثر شیر ام سلطہ بود" (ص ۲۴۳)

یہ روایت بھی معناً ایک ہے لیکن تذکرۃ الاولیا سے نقل کی ہوئی نہیں ہے کیونکہ اس کو بیان کرنے سے پہلے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے یہ فرمایا،

"سخن در بزرگی شیخ معین الدین سجزی افتاد، حکایت فرمود کہ آں روز کہ شیخ معین الدین بخدمت شیخ عثمان ہارونی نور اللہ مرقدہٗ پیوست و بیعت آورد و نیز بر فوائد کہ از زبان گوہر بیان شیخ می شنید آں را بقلم آورد، چنانچہ ایں حکایت در بزرگی خواجہ بصری در آں فوائد نبشتہ دیدہ ام" (ص ۱۶۳)

اس سے ظاہر ہے کہ خواجہ حسن بصری سے متعلق چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں میں ایسی روایتیں برابر بیان کی جاتی رہیں، جو غالباً تذکرۃ الاولیا ہی کی ہوتیں، تذکرۃ الاولیا کی ان ضعیف روایتوں کے دہرانے اور ان کو ملفوظات کے کسی مجموعہ میں قلمبند کرنے سے پورا مجموعہ جعلی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ صوفیائے کرام کی مجلسوں میں اثر پیدا کرنے کی خاطر موضوع حدیثوں کے ساتھ غیر مستند روایتوں کا سہارا بھی لے لیا جاتا۔

افضل الفوائد اور فوائد الفواد میں مشترکہ اشعار کے ہونے سے یہ دلیل فراہم نہیں کی جاسکتی ہے کہ یہ سب کچھ فوائد الفواد سے سرقہ ہے، اگر فوائد الفواد کے اشعار دور نظامی میں پائے جاتے ہیں تو وہ فرضی نہ سمجھے جائیں، لیکن وہی اشعار افضل الفوائد میں پائے جائیں تو یہ مسروقہ قرار دیئے جائیں، یہ عجیب منطق ہے،

اشعار کے غلط نقل ہونے کی مثالیں گذشتہ اوراق میں آچکی ہیں، اس لئے وزن کی غلطیاں بھی ملفوظات کے فرضی ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتیں، اگر مختلف نسخوں

کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سارے شکوک آسانی سے رفع ہوسکتے ہیں،

یہ اعتراض بھی صحیح نہیں کہ افضل الفوائد میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی وجہ تسمیہ غلط بتائی گئی ہے، معلوم نہیں کاکی کی وجہ تسمیہ کتنی بتائی گئی ہیں؟ اور اب تک یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سی صحیح ہے۔

شروع کے خواجگان چشت کے ساتھ افضل الفوائد پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ان جعلی ملفوظات کی تاریخیں بھی اکثر غلط ہیں، اس کا یہ جواب کیا قابل قبول ہوسکتا ہے کہ طبقات ناصری بہت اہتمام سے لکھی گئی ہے پھر بھی اس میں بہت سے سنین صحیح نہیں ہیں تو کیا پھر طبقات ناصری جعلی قرار دی جائے گی، تاریخ فرشتہ میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی غزنین سے لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے ہر، وقت اجمیر آئے جب کہ سید حسین مشہدی المشہور بہ خنگ سوار اجمیر کے داروغہ تھے، اور یہ تاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ بتائی ہے جو یقیناً غلط ہے (جلد دوم ص ۳۷۷) یہی روایت سیرالعارفین میں ہے، (ص ۱۳-۱۲) کیا حضرت خواجہ معین الدین چشتی شہاب الدین غوری کے ہندوستان کے حملہ کے موقع پر اجمیر میں نہ تھے؟ سیرالعارفین میں ہے کہ لاہور میں حضرت شیخ سعدالدین حمویہ کے پیر شیخ زنجانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی بے حد دوستی اور محبت ہوگئی تھی، مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ شیخ حسین زنجانی شیخ علی ہجویریؒ کے پیر بھائی تھے جو شیخ علی ہجویریؒ کے لاہور آنے سے پہلے وفات پاگئے تھے، اسی طرح سیرالعارفین میں ہے کہ جب سال حضرت خواجہ معین الدین لاہور پہونچے اسی سال حضرت علی ہجویری کا انتقال ہوا تھا، یہ روایت بھی صحیح نہیں کیونکہ حضرت علی ہجویری کی وفات سنہ ۴۶۵ھ سے ۵۰۰ھ ہجری کے آغاز تک بتائی جاتی ہے،

جس سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت خواجہ کی پیدائش سے بہت پہلے حضرت علی ہجویری
کا وصال ہو چکا تھا۔ سیر العارفین اور تاریخ فرشتہ میں سنین اور واقعات کی
ان غلطیوں کی وجہ سے کیا یہ دونوں کتابیں جعلی اور فرضی سمجھی جانے کی مستحق ہیں؟
یہ بھی اعتراض ہے کہ ان جعلی ملفوظات کے مجموعوں میں زندگی کی مہک
اور موضوعات میں تنوعات بھی نہیں، ان کے مطالعہ میں دل کو سرور اور
دماغ کو نور حاصل نہیں ہوتا ہے (ص ۷۷) سرور اور نور کا حاصل کرنا ایک
اضافی چیز ہے، بزرگان دین کو تصوف کے ذریعہ سے تصفیہ قلب، تجلیہ باطن،
عشق الٰہی، اسرار الٰہی اور نور الٰہی حاصل ہوا کیے ہیں۔ صوفیائے کرام نے اسلام
کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات
کی تاریخ جگمگا اٹھی ہے، مگر ۱۹۷۶ء میں دہلی میں امیر خسرو کا جو بین الاقوامی سیمنار
ہوا اس میں ایک بیرونی ملک کے ایک بہت ہی ممتاز نمائندہ نے یہ دعویٰ
کیا کہ تصوف کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں، اس کی تائید ہندوستان کے ایک
پروفیسر صاحب نے بھی کی، پھر ۱۹۷۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلام کی تشکیل
جدید پر جو سیمنار ہوا اس میں ایک متقشف عالم نے مجھ سے کہا کہ اسلام کو
تصوف سے جتنا نقصان پہونچا ہے کسی اور چیز سے نہیں پہونچا، موجودہ دور
کے بہت بڑے متکلم اسلام مولانا مودودی کا بیان ہے کہ تصوف کا کام
افیون کا چسکا لگا کر تھپک تھپک کر سلا دینا ہے اور اس کو چنیا بیگم قرار
دیا ہے، اس کے ماننے والے کو مزمن مریض کہا ہے (تجدید و احیاء دین ص ۱۲۰، ۱۲۲)
مگر اسی چنیا بیگم کے عشاق میں سے حضرت خواجہ حسن بصری، حضرت بایزید

بسطامی، حضرت جلال الدین رومی، حضرت عبد القادر جیلانی، حضرت شہاب الدین
سہروردی، حضرت ابو الحسن علی ہجویری، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت
بختیار کاکی، حضرت فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت باقی باللہ،
حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ اور ان ہی کی طرح اور بزرگان
دین اور مردان حق رہے، کیا وہ مزمن مریض رہے، کیا ان سے اسلام کو
نقصان پہونچتا رہا؟ اگر ان کے اسمائے گرامی اسلام کی تاریخ سے نکال دیے
جائیں تو اسلام کی کوئی روحانی تاریخ مرتب نہیں ہو سکے گی۔
اگر تصوف سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا تو اس کے لیے تصوف نہیں بلکہ
تاریک ذہن اور بیمار دل موردِ الزام ہے، رہا نور اور سرور کا حاصل ہونا
تو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو نور اور سرور اس میں حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی
تحقیقات سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ امیر خسرو عاشق مزاج اور عشق باز تھے،
وہ مسلسل عشق کرتے رہنے میں ایمان رکھتے، وہ ایک گائک اور نائک بھی
تھے، ان کی صحبت ڈھاری، ڈفالی اور سازندوں کے ساتھ رہتی تھی، انھوں نے
نہ تو کبھی اپنے کو پارسا ظاہر کیا اور نہ صوفیت بگھاری، بلکہ ہمیشہ اپنے ایک
رند اور قلندر ہونے پر فخر کیا، وہ طماع، ہوس زر میں مبتلا، کذب گو اور
سیہ رو شاعر تھے، اس قسم کے مباحث پروفیسر ممتاز حسین کی کتاب امیر خسرو
حیات اور شاعری میں ملیں گے جو پاکستان میں امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن
کی کمیٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، پروفیسر صاحب کو اس قسم کی باتیں لکھنے میں
خاص نور اور سرور حاصل ہوا، مگر یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری مذہبی، روحانی

اور ثقافتی وراثت کا تمسخر کر کے ہم کو اپنے ماضی کی عظمت سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم کو یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ہم ان جیسے لوگوں کے لیے اپنی تحریروں میں ایسا مواد نہ فراہم کر دیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ تحقیق کی آڑ میں اسلام اور تصوف دشمنی کا ثبوت دیں۔

بزم صوفیہ

دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب بزم صوفیہ کا بکثرت اضافوں کے ساتھ تیسرا ضخیم اڈیشن جس میں، تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابو الحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ بو علی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی (کچھوچھہ) سید گیسو دراز وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل، ان کے ملفوظات کے مجموعوں اور تصنیفات کی روداد بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالحق توشہ، ردولوی کے حالات و تعلیمات کا مستقل اضافہ ہے، یہ بھی سابق الذکر بزرگوں کی طرح صاحب کرامات و ملفوظات ہیں، جن کا مزار آج تک ردولی میں مرجع خلائق ہے، ردولی کے اسی خانوادہ رشد و ہدایت سے ہمارے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا بھی تعلق تھا۔

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن   قیمت: ۱۶-۵۰

"منیجر"

جمالی

لودی اور مغل دور کا شاعر

از ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم ترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

(۳)

متفرقات مندرجہ بالا مثنویات کے علاوہ بوڈلین لائبریری کا مخطوطہ نمبر ۲۴۴۲ اشعار[1] کی ایک مناجات، دو قصیدوں اور چند رباعیوں[2] پر مشتمل ہے۔ بوہار لائبریری کے ایک مخطوطے میں آٹھ اشعار کا ایک قطعہ[3] ملتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطہ جلد دوم میں ایک قطعہ اور بہت سی رباعیاں ملتی ہیں جو ۲۴ صفحات[4] پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک رباعی درج ذیل ہے

آغاز محمد است و انجام علی ست   آشوب محمد است و آرام علی ست
آیات خدا ز کام پیغمبر ماست   اے دوست بدان کہ سر پیغام علی ست

کیا مثنویات جمالی جمالی دہلوی کی کتاب ہے مندرجہ بالا مثنویاں جمالی دہلوی کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ اس جمالی کی نہیں بلکہ کسی دوسرے شاعر کی ہیں۔ جس کا تخلص بھی جمالی ہی تھا۔ اسباب درج ذیل ہیں۔

---

[1] بوڈلین لائبریری کا کیٹلاگ ۸۸، ۸۷، [2] مثنویات جمالی (بوہار) مخطوطہ ورق ۱۳۸ الف

[3] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) مخطوطہ جلد اول ورق ۱۳۰ الف ۱۶۶ تا ۱۲۱ الف [4] ایضاً ورق ۱۸۲ اب

۱۔ بیان الحقائق لکھنے سے پہلے شاعر چوبیس[۲۳] مثنویاں لکھ چکا تھا[۲۴]۔ جس سے ظاہر ہے کہ بیان الحقائق کہن سالی کی تصنیف ہے۔ سیر العارفین، ہمایوں (دورِ حکومت ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء تا ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء) کے نام معنون ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب ہمایوں کے دورِ حکومت[۲۵] میں مکمل ہو چکی تھی۔ اب یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ بیان الحقائق (جو خود پیرانہ سالی کی تصنیف ہے) لکھنے کے مزید سالہا سال کے بعد (جب کہ شاعر بہت بوڑھا اور ضعیف ہو چکا ہوگا) شاعر نے حرمین شریفین اور دور دراز کے اسلامی ممالک[۲۶] کا سفر کیا ہو، اور وہاں سے واپس آکر سیر العارفین مرتب کی ہو۔

مثنویات میں بہت سے ایرانی شیعہ درویشوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن کسی ہندی چشتیہ درویش کا ذکر نہیں ملتا اس سے ظاہر ہے کہ "مثنویات" کا مصنف شیعہ ہے جب کہ سیر العارفین کا مصنف پکا سنی اور سلسلۂ چشتیہ کا صوفی ہے۔ اس مفروضہ کے ثبوت میں کہ مثنویات کا شاعر شیعہ ہے۔ اس کی نظم و نثر سے مندرجۂ ذیل حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مصطفیٰ[۱] گفتا منت یار و رفیق	تو منی و من توام در ایں طریق
روح من در خون تو سر رشتہ اند	در ازل ایں تخم با ہم کشتہ اند

(حضرت علیؑ سے خطاب)

بہ تقویٰ[۲] اقتدا با مصطفیٰ کن	بہ بیں آں قامت و رو در خدا کن

---

[۱] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) مخطوطہ جلد دوم ورق ۱۰۲ ب تا ۱۰۳ ب [۲] سیر العارفین (ندوہ) مخطوطہ ورق ۴ب اور (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۴ الف تا ۴ ب [۳] ایضاً ۱۲ الف۔ ۲ ب [۴] ایضاً ۱۲ الف۔ ۲۰ ب [۵] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) جلد دوم (شرح الواصلین) ورق ۲۲ ب [۶] مثنویات جمالی (بوہار) مخطوطہ فردست ۱۳ ورق ۱۰ ب

پیش[۱] مصطفیٰ بے شک فنا شو	بایں علم و عمل دایم بقا شو

صلی[۲] اللہ علیہ وسلم و آلہ المعصومین وسلم

حضرت[۳] سیدنا محمد و آلہ الطیبین الطاہرین والائمۃ المعصومین

حضرت[۴] سرور دنیا و امام الموحدین علی مرتضیٰ علیہ السلام والتحیۃ والاکرام اگر نہ فرمودہ بودے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ....

بلبلِ[۵] گلزار حضرت مصطفیٰ و حضرت علی مرتضیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام مولانا کاہی علیہ الرحمۃ در ایں باب چہ خوش فرماید ؎

صلوٰۃ دایم آور بر پیمبر	سلام بے عدد دہ خوش بہ حیدر
باحد متصل و آل و اولاد	بجاں بپذیر ایں تلقین و ارشاد

۳۔ یہ "مثنویات" شیخ جمالی دہلوی کی مثنویوں "مہر و ماہ" اور "مرآۃ المعانی" سے پلان اسپرٹ اور اندازِ بیان میں بالکل مختلف ہیں۔ "مہر و ماہ" ایک رومانی مثنوی ہے۔ اور "مرآۃ المعانی" کا موضوع سلوک کے مختلف منازل ہیں، جب کہ "مثنویات" صوفیانہ پند و نصائح پر مشتمل ہیں، اور ان کا کوئی مرتب پلان نہیں، ان کے مختلف حصوں میں ربط پیدا کرنے کے لیے نثر کی مدد لی گئی ہے۔ ان میں عام روایتی مثنویوں کی طرح حمد، نعت اور منقبت نہیں۔ ان کی مثنویاں براہِ راست "موضوعِ سخن" سے شروع ہو جاتی ہیں۔ جب کہ "مہر و ماہ" اور "مرآۃ المعانی" کا ڈھانچہ مثنویوں کے روایتی ڈھانچے کے عین مطابق ہے۔

۴۔ مہر و ماہ اور مرآۃ المعانی کا اندازِ بیان دلکش اور مسحور کن ہے۔ اشعار

---

[۱] مثنویات جمالی ایضاً ورق ۸ الف [۲] ایضاً ورق ۶ ب [۳] ایضاً ورق ۹ ب [۴] ایضاً ورق ۱۰ الف

رواں دواں ہیں، زبان شیریں اور سلیس ہے۔ مگر مثنویات" ان خصوصیات سے مبرا ہیں، ان میں مشکل، بلند آہنگ ادق الفاظ اور محاوروں کی بھرمار ہے۔ عربی الفاظ کے کثرت استعمال نے اس کی شیرینی کو اور بھی زائل کر دیا ہے۔

۵۔ مثنویات کے نثری حصے اور سیر العارفین کا تقابلی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ دونوں نثر دو مختلف افراد کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔

برائے تقابلی مطالعہ نثر کے دو ٹکڑے نمونتاً درج ذیل ہیں۔

(الف) پروردہ ہائے صحبت دوانکہ تقلید ذوق از علم حال برنتواند داشت۔ از بہر آنکہ قول صادق وکاذب یکے می نماید دیدہ حال بینش می باید فرق نیک وبد زبان تواند کرد گوشی بہ نظم وارد حافر نکتہ ہائے جدید و غریب باش کہ ہمچو برق می گزرد و حیف است وہزار حیف است کہ شخص بذکر گذشتہ مشغول باشد و بفکر آئندہ و وقت فوت شد (شرح الواصلین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ جلد دوم ورق ۱۶۶ تا ۱۶۷)

(ب) خواب می بینم کہ اجتماع خلقے انبوہ است و بزرگے ذکر می فرماید کہ ہر کار دنیارا بر کار دین مقدم داند و ہر دو کار از بنگاک افتد و خراب گردد از یکے پرسیدم کہ این بزرگوار کیست کہ وعظ می فرماید را و جواب داد کہ حضرت مخدوم جہانیان است و من ہرگز ایشان را ندیدہ بودم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوں بیدار شدم روز دوم احرام زیارت ایشان بستم

(سیر العارفین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ ورق ۱۷۱ الف)

دیوان جمالی کسی کیٹلاگ میں دیوان جمالی کا نام درج نہیں[1] لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمالی کم از کم

---

[1] جیسے بانکی پور، بوہار، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، آصفیہ، برٹش میوزیم اور بوڈلین لائبریری کے کیٹلاگ

اس کے دو نسخے ہندوستان میں دستیاب ہیں۔ ایک نسخہ حبیب گنج لائبریری علی گڑھ میں اور دوسرا رامپور اسٹیٹ لائبریری میں۔ اول الذکر نسخہ کے اول و آخر کے صفحے غائب ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۹ قصیدے، دو ترجیع بند، ۵ مکمل اور نامکمل ترکیب بند ہیں۔ کل اشعار کی تعداد دو ہزار ایک سو سے زیادہ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

قصائد:- ۱۳ اللہ کی مدح میں ہیں یعنی حمد ہیں، ۴ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں، ۱۲ جالی کے پیر و مرشد شیخ سماء الدین کی مدح میں، ۲ سلطان سکندر لودی کی تعریف میں، ۶ بابر کی تعریف میں، ۶ ہمایوں کی تعریف میں۔

ترجیع بند:- ایک ترجیع بند نعتیہ ایک ترجیع بند عارفانہ۔

ترکیب بند:- چار ترکیب بند جو مکمل ہیں۔ مرثیے ہیں۔ ایک مرثیہ سکندر لودی کا، ایک جالی کے پیر کا، دو جالی کے پیر کے لڑکے کا، ایک خود جالی کے لڑکے کا۔ ایک ترکیب بند جو نامکمل ہے عارفانہ ہے۔

رام پور اسٹیٹ لائبریری کا مخطوطہ ۱۲۵۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۷ قصیدے، ۱ ترجیع بند، ۵ مراثی، ۱۲۸ غزلیں، ۱۷ قطعات، ۴ مختصر مثنویات اور ۴۴ رباعیاں ہیں۔

صاحب مراۃ العالم[1] کا بیان ہے کہ دیوان جالی میں تین ہزار اشعار ہیں، وہ دیوان جو ملا بدایونی کی نظر سے گذرا سات یا آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل تھا[2]

جالی بحیثیت قصیدہ گو | دنیائے شاعری میں جالی کا مقام بلا شبہہ بہت بلند ہے

---

[1] مراۃ العالم ورق ۳۹۶ الف [2] منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۲۳۶ حاشیہ صفحہ ۳۳

اپنے زمانے میں وہ خسرو ثانی کہا جاتا تھا[۱]۔ یوں تو شاعری کے تمام اصناف پر اس کو قدرت حاصل تھی۔ لیکن[۲] اس نے قصیدہ، مثنوی اور غزل کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ ان میں بھی قصیدہ کو اولیت حاصل ہے۔ قصیدوں ہی نے جمالی کو جمالی بنایا ہے۔ صاحب مرآۃ العالم بختاور خاں کا قول ہے کہ جمالی قصیدہ گوئی میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ نمایاں تھا[۳]

جمالی نے سلطان سکندر لودی کی شان میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے شہنشاہ[۴] بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں کی شان میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ بابر کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو[۵]

شاہ دشمن کش ظہیر الدین محمد بابر آنکہ ‏ ‏ لشکر بنگالہ از افغار کابل بشکند

بابر جمالی سے خوش رہتا تھا اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ ہمایوں بھی اس کی بڑی تعظیم کرتا تھا اور اکثر بہ نفس نفیس اس کے مکان پر جاتا۔ بادشاہِ وقت

---

[۱] مرآۃ سکندری صفحہ ۲۵۲۔ شیخ جمالی کنبو شاعر کہ او را ثانی خسرو گفتند [۲] اخبار الاخیار صفحہ ۲۰۱۔ اقسام شعر از مثنوی و قصیدہ و غزل گفتہ۔ حالت شعرا و برا اہل سخن ظاہر است۔ قصیدۂ او بہتر از غزل و مثنوی است۔ ید بیضا ورق ۴۱ ب در اقسام شعر خصوص قصیدہ قوت کمال داشتہ شمع انجمن صفحہ ۱۰۶۔ قصائد او بہتر از غزل و مثنوی است۔ خزینۃ الاصفیا جلد دوم صفحہ ۸۔ در شعر و سخن استاد زمانہ و فرد یگانہ بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقسام اشعار از مثنوی و قصائد و غزل گفتہ ہفت اقلیم ورق ۱۲۹ ب۔ شیخ جمالی در نکتہ پردازی شعر گوئی عدیم المثل عصر خود بود و صاحب قصائد غراست و در جواب قصاید عبدالواسع جبلی قصاید موزون کردہ روز نم روشن صفحہ ۱۵۴۔ اشعار لطیفش سراپا شوق [۳] مرآۃ العالم ورق ۳۹۶ الف

کا کسی مکان پر جانے کو اس زمانہ میں عزت و تعظیم کی انتہا سمجھا جاتا تھا۔ جمالی نے بھی اظہار محبت کے طور پر اس کی شان میں چھ قصیدے لکھے ہیں۔

بختاور خاں کا بیان[۱] ہے کہ مندرجہ ذیل نعتیہ شعر اس زمانے میں بہت مقبول[۲] اور مشہور تھا

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات ‏ ‏ تو عین ذات می نگری باز در صفتی

محاکاتی انداز بیان، ماہرانہ بندش، پر جلال تشبیہ اور اچھوتے استعارے ایک اچھے قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ اور جمالی کے قصیدوں میں یہ بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ عام قصیدہ نگاروں کے مقابلے میں جمالی کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے۔ اس کے "گریز" عمدہ اور قابلِ داد ہیں۔ تشبیب اور قصیدے کے دوسرے اجزا بھی ایک اچھے قصیدے کی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔ قصیدے ایسے رواں دواں اور مسحور کن ہیں کہ قاری کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ تشبیب کب ختم ہوئی اور مدح کہاں سے شروع ہو گئی۔ ہند و پاک کے عظیم فارسی عالم اور نقاد مولانا حبیب الرحمن شروانی نے جمالی کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا ہے[۳] کہ قصیدے کی تمام خصوصیات جمالی کے قصیدوں میں ملتی ہیں، جیسے الفاظ کا طمطراق، بلند پروازیٔ تخیل اور مختلف اجزا میں ربط۔ اس نے

(بقیہ حاشیہ ص) [۴] اخبار الاخیار صفحہ ۲۰۱، ید بیضا ورق ۴۱ ب، خزینۃ الاصفیا جلد دوم، ورق ۸، تذکرۂ علمائے ہند ورق ۴۳ [۵] مرآۃ العالم ورق ۳۹۶ الف۔ اس کے دیوان میں اس قصیدے کے علاوہ بابر کی مدح میں لکھے گئے چھ اور قصائد ملتے ہیں۔

[۱] مرآۃ العالم ورق ۳۹۶ الف۔ [۲] مقالات شیروانی صفحہ ۱۳۱ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۳ء صفحہ ۷ [۳] کے سیر دہلی بھی دیکھئے

قصیدوں میں محض قافیہ پیمائی نہیں کی ہے بلکہ نادر خیالات پیش کیے ہیں" گریز خوبصورتی سے پر اور بعض تو بالکل ہی نادر الوجود ہیں تشبیب موضوع کے عین مطابق ہے"

جمالی نے بلند آہنگ الفاظ استعمال کیے ہیں جو موضوع کے تقاضے کے عین مطابق ہیں"

ہر مصرع میں جوش ہے تخیل کی بلند پروازیوں اور نادر استعاروں کے باوجود زبان کی دلکشی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ بابر کی شان میں لکھے گئے ایک قصیدہ کی تشبیب بطور نمونہ درج ذیل ہے اس سے جمالی کی شاعرانہ مہارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے"

باد جان پرور وزید است ابر نوروزی بهار — شد چمن سرسبز و رقص لاله کن نثار

چار باغ بادشاه دارد نشان هشت خلد — آب جو آمد مثال سلسبیلش در کنار

شد کنار جویبار از سبزه مینائی بساط — تا دهد سلطان گل اندر کنار جویبار

رشته‌هائی از هوا تا چون رو ز بیرون کشید — می کند هر رشته پر باران به در شاهوار

لاله دارد جام یاقوتی پر از می از چه رو — نرگس اندر عین مستی سرگران گشت از خمار

تا کلیم عندلیب آید به دستان در کلام — از برائے او هوا بر شاخ گل افروخت نار

شاخسار سرو و اوراق شجر بنگر که هست — در بر هر برگ طوبی بر سر هر شاخسار

همچو بلبل جانفزایان غنچه را شیرین دهن — همچو رود دل کشایان لاله را رنگین عذار

صوفیان سبزپوش باغ را دعا است دعا — از سرو دو بلبل دو از دست برگ چنار

اندرین موسم که در کشتی نشیند بادشاه — آفتابے دان که اندر ماه نو گیرد قرار

مندرجہ بالا اشعار میں جمالی نے آگرہ کے چار باغ (جو اب رہم باغ کہلاتا ہے) کی کیسی دلکش تصویر کھینچی ہے اس کا پہلا مصرع ہی سامع کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے" اس کے بعد شاعر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ اور ایک خاص ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ اپنے ممدوح

کو کشتی میں بیٹھاتے ہیں۔ کشتی کو چاند سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اور ممدوح کے روشن چہرہ کو آفتاب کہتے ہیں اور پھر ایک اچھوتے انداز میں لکھتے ہیں۔

ع۔ آفتابے داں کہ اندر ماہ نو گیرد قرار

وہ براہ راست ممدوح کی مدح نہیں شروع کرتے ہیں بلکہ ایک غزل کا سہارا لیتے ہیں۔

در بهار بلبش می خواند بلبل این غزل — بر مثال عاشق شوریده دل بر بوئے یار

اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

ای ز رشک عارضت پیوسته گل در خارها — در غم رویت چو من جان داده در هر سو هزار

از چه رو سر بر ندارد لاله در صحن چمن — گر نماند از عارض رنگینت اے گل شرمسار

سنبل پیچان تو از سرکشی مشکین کمند — نرگس فتان تو از خون خوری مردم شکار

چشم تو با طاق ابرو هندوے محراب گیر — خال تو با زلف مشکین کافر زنار دار

مندرجہ بالا اشعار میں ممدوح کا حوالہ دو جگہوں پر آیا ہے لیکن بالارادہ اس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے جس سے تجسس برقرار رہتا ہے اس کے بعد گریز ہے اور پھر جب مدح شروع ہوتی ہے تو ممدوح کا نام ظاہر ہوتا ہے۔

شاه جم سیرت ظهیر الدین محمد بابر آنکه — خاک درگاهش بود مسجود شاهان کبار

از خراسان چون بهندستان شدی آمد ترا — بخت و دولت در یمین و فتح و نصرت در یسار

دشمنت را زندگی شد خواب آسائش محال — خود خیال و خواب را چندان نباشد اعتبار

در مصافے جا شد از گرد و غبار موکبت — چهرهٔ افلاک قیر و دیدهٔ خورشید تار

ملک هندوستان ز انصافت چنان رونق گرفت — رشته بازار او شد نه کابل تا بهار

قصیدے میں مبالغہ آرائی سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے، شعرا اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، لیکن جمالی کے یہاں یہ مبالغہ نہیں ہے، بابر کی مدح میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے بابر بلا شبہہ اس کا مستحق تھا، حقیقتاً وہ تختِ ہندوستان کے لیے مایۂ ناز تھا، دشمن اس کا نام سن کر سہم جاتے تھے۔ فتح و کامرانی اس کے ساتھ چلتی تھی، اس نے ہر قدم پر اپنے دشمن کو شکست دی اور کابل سے بہار تک کا علاقہ اپنے زیرِ نگیں کر لیا،

عام طور سے جذبۂ حصولِ دولت ہی شاعر کو قصیدہ نگاری کی طرف مائل کرتا ہے، عرفی کہتا ہے،

ع قصیدہ کارِ ہوس پیشگاں بود عرفی

لیکن جمالی کا مطمحِ نظر حصولِ مال و زر نہیں تھا، وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ صوفی بھی تھے، اس لیے ان کے یہاں تمنائے زر کا وجود نہیں اور نہ وہ قصیدے میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں،

پانی پت کی پہلی لڑائی ہندوستان میں لڑی جانے والی خوفناک لڑائیوں میں سے ایک ہے، اس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا، افغان ہار جاتے ہیں، بابر کی فتح ہوتی ہے، اور بابر ایک عظیم الشان مغل سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، جمالی اس لڑائی کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

ز افغان فغان بر آمد آندم کہ شد حمات
اشباح را بخرب ارواح را غسل

از صدمۂ سمندت ہر فیل کوہ پیکر
در خاک و خوں فرو شد مجنوں حمار در گل

در حلقۂ سپاہت کا مد عدو پہ از خوں
چوں نقطہ از سرخی در چشم گشتہ داخل

چوں در دعا بر آمد بسم اللہ از زبانت
از خنجرت ہماں دم خصمم تو گشت بسمل

یک دم ز قلب افغان تیغت نہ گشتہ یکسو
کے آب در گرد دو با خوں چو گشت واصل

مردن گند بد خصمت بہ زندگی کہ او را
مشکل نمود آساں آساں نمود مشکل

جمالی بحیثیت غزل گو

فارسی کی سب سے مقبول صنفِ شاعری غزل ہی ہے، اس زبان کی دلکشی اور شیرینی عشق کے معاملات اور واردات کی تصویر کشی میں معاون ہوتی ہے، اسی لیے اس زبان کی عشقیہ شاعری کے بے بہا نادر اور دلکش اشعار بکثرت ملتے ہیں، متقدمین نے غزل کو اظہارِ عشق کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، وہ جذبات کا اظہار سیدھے سادے انداز میں کرتے تھے، ان کی غزلوں میں سچائی اور سادگی ہوتی، مبالغہ نہیں ہوتا، لیکن دورِ وسطیٰ میں سادگی اور سچائی کی جگہ بلندیِ تخیل اور نزاکتِ خیال نے لے لی، جس سے غزل کا دامن وسیع ہوا اور اس میں دوسرے مضامین بھی بیان کیے جانے لگے، جمالی متقدمین کے دور کے آخری شاعر ہیں، ان کے یہاں کہیں تو سعدی اور خسرو کی سادگی اور کہیں سلیمان اور خواجو کی دلکشی ملتی ہے، وہ صوفی بھی تھے۔ اس لیے ان کے اشعار میں صوفیانہ صداقت بھی پائی جاتی ہے، ان کے یہاں آمد زیادہ ہے اور آورد کم ہے، اسی کے ساتھ ان کے یہاں موسیقیت کا لطف بھی ہے۔ ان کی ایک غزل نمونتاً درج ذیل ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اس میں متقدمین کا کتنا رنگ جھلکتا ہے۔

جاں ز تیغ بر دی مرا گر ز اشتی خوار ایں چنیں
کے روا باشد کہ بگزاری بیک بار ایں چنیں

چوں بود حال گرفتاری کہ ہر دم باشد شق
سینہ پر سوز و پنہاں و دیدہ خونبار ایں چنیں

تو گل باغ بہشتی و من از ہجر تو خار
آنچناں گل را بباید لا جرم خار ایں چنیں

پائے دل در بند زلفت گردن جان در کمند — کس مبادا در جہاں ہرگز گرفتار این چنین

حال مردم در ضعیفی تا چہ ساں باشد کہ ہست — چشم شوخت خوں فشاں و غمزہ خونخوار این چنین

سینہ بریاں، دیدہ گریاں، پریشاں، جاں خراب — این منم یارب بدرد عاشقی زار این چنین

گر جمالی بر رخت پروانہ ساں سوزد چہ باک — شمع گر انیست خواہد سوخت بسیار این چنین

ان اشعار میں جذبات کی گہرائی بیان کی سادگی اور خیال کی ندرت سے بڑی تاثیر پیدا ہوگئی ہے، ان میں شعر گوئی کے فن کی مہارت بھی عیاں ہے، متوسطین کی طرح ان کے اشعار میں بندش کی چستی، بیان کا اچھوتا پن بھی ملتا ہے، اس کی تائید میں ان کی ایک اور غزل پیش کی جاتی ہے[1]

این چنیں قد کہ راست می گوئیم — یعلم اللہ کہ راست می گوئیم

در دہان ولبت بجان بخشی — ہمہ لطف خدا است می گوئیم

سر زاہد چوں تو، بہ مستان — بشکستی روا است می گوئیم

گفتم این درد را چہ درمانست — گفت مرگت دوا است می گوئیم

پیشۂ او جفا ست می گوید — کار و بار م وفا ست می گوئیم

عہد و پیمان و عدۂ وصلت — ہمہ باد و ہوا ست می گوئیم

"سراپا" دور وسطیٰ کی چیز سمجھی جاتی ہے جس میں معشوق کے ایک ایک عضو کی تعریف میں شعر کہنے میں خوب خوب اختراعات کیے گئے ہیں لیکن ان شاعروں سے بہت پہلے جمالی نے بھی "سراپا" فنکارانہ انداز میں لکھا ہے[2]

---

[1] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۱۷۳ [2] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۳۳۴

دل بردہ زمن باز مہ مہر فزائی — خورشید رخی، عشوہ گری، فتنہ فزائی

کان نمکی، شہد لبی، تنگ دہانی — شیریں حرکاتی، صنمے ماہ لقائی

سیمیں ذقنی، گل بدنی، لالہ غداری — رشک چمنی، سرو قدی، سبز قبائی

زیبا صنمی، رخ سمنی، آفت شہری — بیدادگری، دل شکنی، ترک خطائی

ابرو شکنی، تیر زنی، سخت کمانی — شمشیر کشی، خلق کشی، عین بلائی

بے رحمی و آشوب گری رہزن دینی — اسلام بری، کفر دہی، زہد ربائی

گر حال جمالی زغمش باز نہ پرسی — دل گم شدۂ، جاں بکفی، بے سر و پائی

"انسان خطا کا پتلا ہے" فارسی شاعری کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کا کمال معصوم اور بے خطا ہونا نہیں، عظیم انسان وہ ہے جس سے گناہ سرزد ہو اور احساس گناہ کی خلش اسے خدا کے سامنے سرنگوں کر دے، وہ توبہ کرے اور خدا سے معافی کا طلبگار رہے، اس موضوع پر لا تعداد اشعار ملتے ہیں، جمالی نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے جس سے ان کا دیوان بھرا ہوا ہے ذیل کے دو اشعار ان کی اخلاص مندی کے آئینہ دار ہیں[1]

اگرچہ در خور قہریم از گنہگاری — بود بہ لطف تو چشم امید واری ما

زبیک تو تیغ ابر کرم فرو شوئی — غبار جرم ز رخسار شرمساری ما

"انسان اگر گناہ نہ کرتا تو خدا کی رحمت کا وجود نہ ہوتا" یہ خیال دور وسطیٰ کے شاعروں کا رہا ہے، متوسطین نے یہ تخیل پیدا کیا کہ گناہ ہی اللہ کی رحمت کو جوش میں لاتا ہے۔ اس خیال کو جمالی نے کتنے خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے[2]

---

[1] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۱۳۳ [2] ایضاً ص ۱۳۳

جمالِ عفو تو کے آمدے بروں ز نقاب
اگر نہ روئے نمودے گناہگاری ما

زاہدوں کی درگت بنانا، نہیں برا بھلا کہنا، فارسی شاعروں کا محبوب موضوع ہے اس موضوع پر بھی جمالی کا ایک شعر ہے[1]

سبحۂ زاہد چو تو بہ مستاں
بشکستن رواست می گویم

جمالی نے اپنے احساسات و جذبات ہی کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے ان کے یہاں تصنع نہیں اور دور از کار استعارات بھی نہیں[2]

دلم صد چاک و جاں غمناک تا کے
تنم در خون سرم در خاک تا کے

دلم بے تو چو مرغ نیم بسمل
بخوں آلودہ و ناپاک تا کے

بسم از آتش دل خشک تا چند
دو چشم از خون دل نمناک تا کے

ندانم بے مہ روے تو ہر شب
رود آہم سوئے افلاک تا کے

مرا چوں کشت زہر ما بہ الفت
بجویم از لبت تریاک تا کے

چو گل بدرید غم پیراہن صبر
ز خارم دامن دل چاک تا کے

جمالی کن ز غیر دوست دل پاک
تنت پاک و دلت ناپاک تا کے

جمالی نے قصیدوں کے بیچ بیچ میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ عموماً قصیدوں کے لیے سخت زمین چنی جاتی ہے اس لیے قصیدوں کی زمین میں کم تر ہی غزل کامیاب ہوتی ہے لیکن جمالی قابل تحسین ہیں کہ یہاں بھی اپنے فن کی مہارت دکھاتے ہیں۔

در ہوائے مجلسش می خواند بلبل ایں غزل
زد گریباں تا بدامن چاک ازیں گفتار گل

اے قدت شمشاد عارض لالہ و رخسار گل
لالہ ات ریحاں دمد شمشادت آرد بار گل

---

[1] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۱۷۳ [2] ایضاً ص ۶۴۴

قصیدے کے درمیان کہی ہوئی ایک دوسری غزل کا مطلع یہ ہے۔

اے ز رشک عارضت پیوستہ گل در رخار خار
در غم رویت چوں من جاں دادہ در ہر سو ہزار

صاحب اخبار الاخیار[1] کا بیان ہے کہ جمالی کے قصیدے ان کی غزلوں سے بہتر ہیں جمالی صوفی تھے انھوں نے خدا سے لو لگا رکھی تھی، ان کا دل محبت سے لبریز تھا اس لیے ان کی غزلوں میں بھی عشقیہ جذبات کے اچھے پہلو ملتے ہیں، ان کے قصیدوں کی تشبیب میں بھی تغزل کا رنگ ہے، قصیدوں کی سنگلاخ زمینوں میں بھی وہ دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔[2]

جذب شبنم باشد از خورشید رویت در عرق
بو العجب کارے کہ شد در زہر شبنم آفتاب

گر تو چشمی چشم کے نازک بود مانند روح
در تو روحی کے بود در روح مجسم آفتاب

اشک من از خیالت ہمچوں غم تو حاضر
صبر من از فراغت ہمچوں دہانت غائب

دوسرے اصناف سخن جمالی کے قطعات، رباعیاں، ترکیب بند، ترجیع بند اور مرثیے میں ان کی فنکارانہ مہارت نظر آتی ہے، ان کے قطعات کا ایک نمونہ یہ ہے[3]

ہر جا کہ رود عزیز گردد
چوں ترک وطن کند خردمند

گوہر چو ز کان خود بروں شد
قیمت بودش زیادہ صد چند

گرچہ بدنش کنند سوراخ
سازند بتاج شاہ پیوند

چوں شیرہ ز نی شکر بروں شد
در جوش فتد وے شود قند

موضوع کے لحاظ سے جمالی کی رباعیوں میں نیا پن نہیں ہے، انھوں نے عام موضوعات جیسے معرفت، تسلیم و رضا، عشق، کائنات کی فنائیت اور اخلاقی مضامین

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۰، ید بیضا ورق ۹۴ ب، شمع انجمن ص ۱۰۶ [2] دیوان جمالی (رام پور اسٹیٹ لائبریری) ص ۷۷ [3] ایضاً ص ۰ ۷ [4] ایضاً ص ۵۹۴

ہی قلمبند کیے ہیں لیکن ان کے انداز بیان سے پامال موضوعات میں بھی کچھ جان پڑ گئی ہے، نمونتاً چند رباعیاں درج ذیل ہیں،

اگر درپے[1] من حاسد بے باک افتد — زد غلغلہ در عالم افلاک افتد
اودر دعشم بگیرد از بد گوشش — من خاکم و اندر دھنش خاک افتد

بازلف[2] در رزش دلم آویختہ باز — باز آمدم از خویش چو چشم شدہ باز
بازوم کشیدہ و گفت بازی مہباز — بازی نکند ہیچ کبوتر با باز

یارب[3] ز کرم بخش من بیدل را — سودا زدۂ خیال بے حاصل را
بے توشہ و بے رفیق و بے منزل را — در راہ فتادہ بار و پا در گل را

آنکس[4] کہ ترا شناخت از خود بگذشت — از شائبۂ قبول و ز رد بگذشت
از بہر تو زیست و برائے تو بمرد — از ہر دو جہان پاک و مجرد بگذشت

مائیم[5] وجودے ز حقیقت محروم — ایں ہستی ما چیست خیال موہوم
اول ہمہ نا بودۂ و آخر معدوم — معدوم کند ہستی حق چوں معلوم

جامی کے مرثیے بھی پر اثر ہیں، انھوں نے رسمی طور پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا، ان کے سب ہی مرثیے ان کے دوست یا عزیز کی موت پر لکھے گئے ہیں، اسی لیے ان کے غمناک جذبات میں حقیقی رنگ پایا جاتا ہے، انھوں نے پیر و مرشد شیخ سماء الدین کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا مطلع یہ ہے

اے دیدہ خوں بریز کہ دلدار غائب ست — یعنی جمال آں مہ رخسار غائب است

[1] دیوان جامی ص ۸۰۲ [2] ایضاً ص ۸۷۸ [3] ایضاً ص ۸۷۹ [4] ایضاً ص ۸۷۶

ان پر شیخ سماء الدین کی موت کا گہرا اثر تھا جس کی شہادت یہ مطلع دیتا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنے لڑکے اور اپنے پیر و مرشد کے لڑکے کی موت پر جو مرثیے لکھے ہیں وہ بھی بہت دردناک ہیں، سلطان سکندر لودی کا مرثیہ بھی غم و اندوہ سے بھرا ہوا ہے اس کا مطلع ہے،

خلق حیران و پریشان کہ شہنشاہ چہ شد — ہمہ بر سینہ زناں دست کہ اللہ چہ شد

اس مرثیہ میں یہ بات نئی ہے کہ وہ مرثیہ کے اختتام پر نئے بادشاہ کو خوش آمدید کہتے ہیں،

یاد مچہ سزا دار سریر و دیہیم — مردم چشم تو سلطان جہاں ابراہیم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامی نے بھی "بادشاہ مر گیا، بادشاہ زندہ باد" کا نعرہ لگایا ہے

آخر میں جامی کے دو مطلعے پیش کیے جاتے ہیں جو بلا شبہہ اچھے شعراء کے بہترین اشعار کے مقابلے میں رکھے جاتے ہیں، پہلا مطلع ترجیع بند کا ہے اور دوسرا ترکیب بند کا۔

اے رخت در جمال تو پیدا . وے جمال تو بر رخت شیدا
مائیم خلاصۂ دو عالم . تفسیر حروف اسم اعظم

خواجگانِ چشت کے ملفوظات

سے متعلق ایک مکتوب

بنام

سید صباح الدین عبدالرحمن

از مولانا اخلاق حسین دہلوی

مزاج مبارک۔ مارچ ۱۹۶۹ء کا معارف ایک دوست کی وساطت سے مل گیا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے آپ کا مضمون "امیر خسرو اور افضل الفوائد" پورے انہماک اور توجہ سے مطالعہ کیا۔ یہ پہلی قسط ہے۔ دیگر اقساط کا منتظر ہوں۔ آپ کی تحقیق و تلاش اور نکتہ رسی کی داد دینا سورج کو چراغ دکھانے کی مصداق ہے۔

ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

خوب لکھا ہے اور تفصیل سے لکھا ہے

اس دوران میں میرے علم میں یہ بھی آیا کہ دلی کی کسی پبلک لائبریری میں معارف نہیں آتا۔ میں نے فتحپوری لائبریری کے ارکان کو توجہ دلائی ہے انھوں نے وعدہ بھی کیا ہے۔ ایفا کب ہوگا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ع وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا۔

یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا کہ معارف کی کتابت و طباعت کا وہ معیار نہیں رہا جو تھا کاتب صاحب احتیاط سے کام لیں، قلم جما کر لکھیں اور املا صحیح بنائیں، نوک پلک کا بھی خیال رکھیں، مشین مین صاحب روشنائی کی وارنش کی آمیزش گوارا کریں تو معیار پر آجائے

کا بقول مہدی افادی پیکر جمیل بہ لباس حریری دل کو بھاتا اور لبھاتا ہے۔

اس کے بعد موضوع سے متعلق یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ خیر المجالس میں فوائد الفواد کے حوالے سے جو عبارت منقول ہے قطع نظر اس سے کہ وہ بعینہ فوائد الفواد میں نہیں ہے۔ مگر ان ناقدین کے لیے اساس ہے جو کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے کے درپے ہیں، یہ پوری عبارت انمل، بے جوڑ، اسقام سے بھرپور اور اس لائق ہے کہ تجزیہ کرکے بتایا جائے کہ یہ نہ کسی صاحب کمال کے قلم سے نکلی ہے، اور نہ اسے اساس بنایا جاسکتا ہے، یہ تو کسی کم سواد کی کارستانی ہے،

متکلم کا بیان ہے۔ "من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ" متکلم نے کسی کے پاس کتاب دیکھی، غالباً اسی مماثلت سے اس کو یہ شبہہ ہوا کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، یہ رائے خود دیکھنے والے نے قائم کی ہے۔ کسی نے اسے بتایا نہیں ہے کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق اتنا ہی ذہن نشین رکھنا کافی ہے جملے کا آخری حصہ "از تصنیف شیخ" یہ مبہم ہے۔ لفظ شیخ وضاحت کا متقاضی ہے کہ شیخ سے مراد کون ہے؟ یہ جملہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو بولا گیا ہے گویا کہ لفظ شیخ سے مراد حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں، محل گفتگو اور آداب مجلس کا اقتضا یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا اضافہ بھی ہو کیونکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس وہ مجلس تھی جہاں اچھے اچھے باکمال عجز و نیاز سے سر بہ خم رہتے تھے۔ صرف شیخ کہہ دینا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو کہنا ہرگز قرین قیاس نہیں،

اس کے بعد اس کا جواب ہے۔ جو حضرت محبوب الٰہی کی زبانی نقل کیا ہے یہ بھی فوائد الفواد کی مسخ شدہ عبارت ہے۔ جو بے محل اغلاط سے پُر اور کسی ایسے شخص کی مسخ کردہ ہے۔ جو بالکل ہی مبتدی ہے بلکہ مبتدی سے بھی گیا گزرا ہے، اس میں تحریف بھی ہے اور

اور الحاق بھی جو ہرگز مذکورہ بیان کا جواب نہیں ہے، اسے بطور جواب حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنا بہت بڑی گستاخی اور سراسر افترا ہے، وہ مبتدی جسے فارسی میں ذرا بھی شد بد ہے۔ وہ بھی مذکورہ بیان کا یہ جواب نہیں دے سکتا، جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کیا گیا ہے جو عالم و عارف، زبان دان و اہل زبان اور برگزیدہ و عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ جواب یہ ہے: "او تفاوت گفتہ است من ہیچ کتاب تصنیف نہ کردہ ام و خواجگان ما نیز نہ کردہ اند" متکلم مخاطب و موجود ہے۔ پھر "او" اور "گفتہ" کا کیا محل ہے۔ متکلم نے جو کچھ کہا ہے اپنے صیغۂ ابد سے کہا ہے کسی نے اس سے کچھ کہا سنا نہیں ہے۔ افعال اور ضمائر کی ایسی غلطیاں مبتدیوں سے بھی کم ہی ہوتی ہیں، کسی معقول پڑھے لکھے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی چہ جائے کہ کسی عالم و زبان داں سے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تو کچھ اس طرح فرماتے۔ تفاوت دیدی۔ تفاوت می گوئی۔ ...... بلاشبہہ یہ تفاوت کثیرہ یہ جملے فوائد الفواد سے منقول ہیں۔ ناقل پہلے جملے کے محل استعمال سے ناواقف، دوسرے جملے میں کتابے کی یائے وحدانی حذف کر دی ہے، جو کسی ایک کتاب کی نمائندہ تھی، عمل تحریف سے بنشتہ ام کو تصنیف نہ کردہ ام کر دیا ہے، تیسرے جملے کا اضافہ فرمایا ہے، جو حشو اور کھلا عیب کلام ہے اور الحاقی ہے، یہ ہے وہ ساری کائنات جو کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے کی اساس ہے، یہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں، کیسے دانشور ہیں وہ نقاد جو پانی پر پاڑ باندھتے اور ہوا پر محل بناتے ہیں۔ کھوکھلی بنیاد کو ذرا چھیڑیے عمارت دھڑام سے منہ کے بل آپڑے گی۔ آپ نے کمال ایجاز سے یہ فرمایا ہے: "خواجگان چشت کے

بن ملفوظات کو جعلی و فرضی قرار دیا جاتا ہے، اس کا محض قیاس ایک مبہم اور غیر واضح بیان سے کیا جاتا ہے، میرے نزدیک خیر المجالس کی مذکورہ عبارت کی نباحت وضاحت کی مقتضی ہے۔

مولانا حمید قلندرؒ سے تو یہ توقع نہیں کہ وہ یہ بے سروپا عبارت لکھتے، یقیناً یہ کسی کم سواد ستم ظریف کی کارستانی ہے، اور ایسے ہی عقل کے پورے اس کو معتبر مانتے ہیں۔ حیرت ہے ان دانشور نقادوں پر جن کے لیے یہ اساس ہے۔ خیر المجالس کے باب میں یہ بھی دشواری ہے کہ اس کے قدیم نسخے دستیاب نہیں ہوتے۔ ایک نسخہ سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں ہے۔ جو چند در چند اوراق کا مجموعہ اور ناقص ہے۔ ایک نسخہ اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد میں ہے۔ جسے آصفیہ لائبریری کہتے تھے، یہ ۱۳۱۳ھ کا مکتوبہ ہے، مطبوعہ نسخہ اسی کی آواز بازگشت ہے، لطیفہ یہ ہے کہ کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے والے نقاد جن کتب ملفوظات کو مستند قرار دیتے ہیں ان ہی کے قدیم نسخے نایاب ہیں، درر نظامی کا ایک نسخہ ہے جو سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کی زینت ہے، اور بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، فوائد الفواد کا قدیم ترین نسخہ ۱۱۶۱ھ کا مکتوبہ ہے، یہ بھی سالار جنگ میوزیم ہی میں ہے،

یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ فاضل نقاد نے مولانا رکن الدین کاشانیؒ کی کتاب کا نام شمائل الاتقیاء و دلائل الاشقیا لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے، مولانا رکن الدین کاشانی کی کتاب کا نام "شمائل التقیا و دلائل التقیا" ہے، یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے، فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ

۱۔ معارف، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خیر المجالس کا جو نسخہ شائع کیا ہے وہ فاضل مکتوب نگار کی نظر سے ضرور گذرا ہوگا۔

مطبوعہ ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۱۸۰، ۱۸۵ میں ۷ ۱۱۹ تحریر ہے، اور ۱۳۱۱ھ کی مکتوبہ ہے۔ ایک نسخہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے، جو ۱۲۴۰ھ کا مکتوبہ ہے، مرحوم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم (نولکشوری) صفحہ ۱۱۰ میں یہی نام لکھا ہے، اور مصنف کا مختصر سا حال بھی لکھا ہے، مجھے بھی ایک ایسے نسخے سے استفادہ کی سعادت نصیب ہے، جو ۱۲۶۵ھ کا مکتوبہ ہے، جس کے ابتدائی اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رفیق الاتقیاء[1] کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے،

یہ بھی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ سیر الاولیا (چرنجی لال اڈیشن) صفحہ ۱۸۰ تا ۵۹۲ میں۔ نکتہ در بیان مردے کہ ایشاں مستغرق باشند در خواب و خور و ایشاں را یاد نہ باشد" کے تحت تمہیدی اور اختتامی چند سطور اور بعض بعض الفاظ اور جملوں کے سوا جو معانی کہنے اور ربط قائم رکھنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں تمام عبارت تاریخ فیروز شاہی برنی کے جستہ جستہ مقامات سے ماخوذ ہے، اس نکتے سے متعلق جملہ عبارت الحاق ہے، جس کے متن کا کا تعلق سیر الاولیا سے نہیں ہے، یہ نکتہ سیر الاولیا کے معدودے چند ان نسخوں میں ملتا ہے، جو ۱۱۵۱ھ عہد محمد شاہ کی مرتبہ سیر الاولیا سے منقول ہیں، اور دوں میں نہیں ہے، چرنجی لال اڈیشن بھی اسی کی آواز بازگشت ہے، عنوان کو متن سے ربط نہیں، متن تمام تر احوال شاہان و امرا پر مشتمل ہے، جگنو کی سی

---

[1] معارف ۱۳۱۰ھ میں شیخ رکن الدین کی یہ کتاب اشرف پریس حیدر آباد سے چھپی ہے، اس کا نام ٹائٹل پر شمائل الاتقیا ہی لکھا ہوا ہے، اور اسی نام سے مشہور ہوئی۔

چمک البتہ کہیں کہیں ملتی ہے، جو انشا کا قبیح ترین نقص ہے، امیر خورد کرمانی کے اسلوب کا یہ توجی نہیں ہے، عنوان کی عبارت میں بھی وہ ندرت و صفائی، شگفتگی و دلآویزی نہیں جو امیر خورد کرمانی کے اسلوب کا خاصہ ہے،

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ۱۰۷۰ھ کا مکتوبہ سیر الاولیا کا نسخہ ہے، جس کا پہلا کیٹلاگ نمبر ۱۲۴۳ اور بعد کا ۱۲۰۵ ہے، جو معلومہ نسخوں میں قدیم ترین ہے، اس میں متن سیر الاولیا کے اختتام کے بعد کچھ اوراق خالی ہیں، پھر یہ عبارت مرقوم ہے، گویا کسی کی یادداشت ہے، اس کے آغاز میں نہ عنوانی عبارت ہے نہ نکتہ مرقوم ہے، نہ کسی باب سے اس کا تعلق ہے، نیز مضامین میں بھی یہ نکتہ اور عنوان نہیں ہے،

یہ بھی لطیفہ ہے کہ امیر خورد کرمانی کا سنہ وفات ۷۷۰ھ ہے، اور مذکورہ عبارت میں ۱۱۳۵ھ تک کا احوال ہے، مرزا مظہر جان جاناں کے شیخ طریقت سید نور محمد بدایونی کا سنہ وفات بقول مرزا مظہر ۱۱۳۵ھ ہے، مگر وہ ۷۷۰ھ میں سیر الاولیا کے ناقل کاتب ہیں، الحاق کے شغف میں ان دانشوروں کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا کہ جو دنیا سے گذر گئے، وہ دنیاوی کتابوں کے مصنف اور کاتب و ناقل نہیں ہوا کرتے،

سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں، معارف اپریل کا منتظر ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ افضل الفوائد کی مجالس کی تاریخوں کا نقشہ میں آپ کو بھیج دوں، اور آپ اپنے قلمی نسخے سے مقابلہ کرا کے مجھے بھیج دیں، مجھے توقع ہے کہ اس باب میں آپ میری رہنمائی فرماتے رہیں گے، کیا اچھا ہو جو آپ کسی ایک مجموعہ ملفوظات پر لکھتے رہیں، اور معارف میں شائع کرتے رہیں، بعد ازاں ان سب کو کتابی شکل میں شائع کر دیں، یہ ایک اچھی خدمت ہو گی، دعائے خیر کا طالب ہوں،

تلخیص و تبصرہ

آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمان

آسٹریلیا کے مسلمانوں کے بارہ میں پچھلے دنوں مختلف رسائل میں مضامین شائع ہوئے، ہم سعودی عرب کے ہفتہ وار رسالہ الدعوۃ کے ایک مضمون کا خلاصہ ذیل کی سطور میں پیش کر رہے ہیں (م ن)

آسٹریلیا کا کل رقبہ ۲۹ لاکھ ترسٹھ ہزار نو سو مربع میل (۷۶ لاکھ ۸۶ ہزار نو سو مربع کیلو میٹر) اور ۱۹۷۶ء و ۱۹۷۵ء کی مردم شماری کے حساب سے مجموعی آبادی ایک کروڑ اکتیس لاکھ اکتیس ہزار تین سو افراد پر مشتمل ہے، اس کے زیادہ تر باشندے عیسائی ہیں مسلمان مجموعی آبادی کا ایک فی صد ہونگے، ان کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے کچھ اوپر کیا جاتا ہے، علاقہ وار ان کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے

نیو ساؤتھ ویلز، چالیس ہزار	وکٹوریہ پچاس ہزار
کوئنس لینڈ، دو ہزار	مغربی آسٹریلیا ڈھائی ہزار
جنوبی آسٹریلیا ڈھائی ہزار	تسمانیا دو ہزار
شمالی آسٹریلیا پانچ سو	دارالسلطنت کینبرا دس ہزار

یہ سب یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں، بلکہ اکثر یوگوسلاویہ البانیہ ملیشیا ہندوستان ترکی اور عرب ملکوں سے تجارت و تعلیم کے سلسلہ میں آئے ہیں، ان میں سے کچھ آباد بھی ہوگئے ہیں

اسلام کی تاریخ اس براعظم کو جب یورپین باشندوں نے آباد کرنا چاہا تو آبادکاری میں مدد کی غرض سے کچھ شتربانوں کو لائے تاکہ ان کے ذریعہ صحرائی علاقوں کو عبور کرسکیں، اور ملک کے نشیب و فراز سے واقف ہوں، ذخائر کا پتہ چلائیں اور تعمیر و ترقی کا بندوبست کرسکیں، انہی ساربانوں کے ذریعہ اسلام یہاں پہونچا، اس سلسلہ میں ایک کشمیری مسلمان دوست محمد اور کچھ پشاوری اور افغانی مسلمانوں کا نام لیا جاتا ہے، انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا، اور فریضۂ حق کی ادائگی کے لئے مساجد بھی تعمیر کیں، موٹر، ریل اور ہوائی جہازوں کے بعد اونٹوں کا دور ختم ہوگیا تو کاروانوں کی گذرگاہیں متروک ہوگئیں اور اکثر مساجد ختم ہوگئیں، اب صرف دو ایک باقی رہ گئی ہیں، پرانے شتربان تعلیم یافتہ نہ تھے، عربی زبان سے ناواقفیت اور حفظ قرآن پاک کے عدم رواج کی وجہ سے ان کی اسلامی زندگی پر ملکی باشندوں کا اثر پڑا، یہاں کی عورتوں سے شادی کی وجہ سے بھی ان کی معاشرت متاثر ہوئی اور اسلامی زندگی کو صدمہ پہونچا،

۱۹۵۵ء سے قبل اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی مگر اس کے بعد مہاجرین کی آمد بڑی تیزی سے شروع ہوئی، یہ مہاجر مختلف علاقوں اور ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور زبان، تہذیب و معاشرت کی بنا پر مختلف حلقوں میں تقسیم ہیں، ان کی سوسائٹیاں اسلام کے بجائے ملکی اساس پر ہیں، جیسے شامی، ھندی، ترکی وغیرہ، خدا کی ذات سے امید ہے کہ یہ انتشار بلد دور ہوجائے گا،

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا — اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور الگ الگ نہ ہوجاؤ

کے حسب منشا اسلام کے زیر سایہ منظم و متحد ہو جائیں گے،

اسلامی سرگرمیاں ان مہاجرین نے بعض اسلامی تنظیمیں قائم کی ہیں، جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت

کے حسب منشا اسلام کے زیر سایہ منظم و متحد ہو جائیں گے،

اسلامی سرگرمیاں ان مہاجرین نے بعض اسلامی تنظیمیں قائم کی ہیں، جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتی ہیں، ان کے ذریعہ تہذیب جدید کی دسیسہ کاریوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان میں مندرجہ ذیل تنظیمیں قابل ذکر ہیں،

(۱) جمعیۃ نیوساؤتھ ویلز، (اس کا قیام ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا) (۲) جمعیۃ اسلامی سڈنی (۳) جمعیۃ اسلامی نیوٹاؤن (۴) جمعیۃ اسلامی تسمانیا (۵) جمعیۃ الطلبہ تسمانیا، (۶) مرکز اسلامی کینبرا

مذکورہ بالا تنظیموں نے بہت سے دینی مرکز، مکاتب اور مساجد قائم کی ہیں، جن کے ذریعہ اسلام کی روشنی پھیل رہی ہے، مگر ابھی یہ کام بہت محدود طور پر ہو رہا ہے،

مسلمانوں کی حالت اس وقت آسٹریلیا کے مسلمان بڑی کسمپرسی کا شکار ہیں، ان کی زیادہ تعداد مزدور پیشہ ہے، وہ اسلامی تعلیمات سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اکثر پنج وقتہ نماز کے پابند نہیں ہیں، صرف نماز جمعہ پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں کچھ نے اسلامی ناموں کو چھوڑ کر مسیحی نام اختیار کر لیے ہیں، اور اسلامی انجمنوں سے ان کا کوئی ربط و ضبط باقی نہیں ہے، ان مہاجر مسلمانوں میں کچھ پڑھے لکھے ڈاکٹر، انجینیر و ہنرمند بھی ہیں مگر انھوں نے کسب معاش کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے، ان کو عملاً اسلامی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں، صرف زبانی اسلام کا دم بھرتے ہیں، اسی بے عملی کی وجہ سے آج تک آسٹریلیا میں مسلمان دینی و

سیاسی قوت نہ بن سکے، نہ اپنا وزن و وقار قائم کرا سکے،

مسلمانوں کو درپیش خطرات آسٹریلیا کے مسلمان بڑے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں، استعماری قوتیں نہیں چاہتی ہیں کہ ان کے قدم یہاں جم جائیں، وہ عیسائی مشنریز کو اس غرض سے استعمال کر رہی ہیں، ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو ان کے دین سے منحرف کر کے عیسائی بنا لیں، اور بڑی عمر کے مسلمانوں کو عیسائی عورتوں سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر کے اسلام سے بے تعلق کر دیں، اسی کے ساتھ قادیانیت نے اپنی دلفریب چالوں سے مسلم عوام کو گمراہ کرنا شروع کیا ہے، وہ بھی مشنری اسپرٹ سے کام کر رہے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے عقائد میں اختلال پیدا کر سکیں، ان دو عظیم خطروں کی موجودگی میں مسلمانوں کے آپسی اختلافات بھی ان کے شیرازہ کو منتشر کر رہے ہیں، اور ان اختلافات سے ان دونوں اسلام دشمن تحریکوں کو غذا مل رہی ہے،

دعوت اسلامی کا موقف دعوت اسلامی کے سلسلہ میں محتاط اندازہ یہ ہے کہ آسٹریلیا میں اسلام کو صحیح، قوی اور موثر صورت میں ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے، چند نفوس اپنی انفرادی جد و جہد سے دعوت اسلامی کا کام انجام دے رہے ہیں، اگر یہ انتشار دور ہو جائے اور اجتماعی طور سے دعوت اسلامی کا فریضہ انجام دیا جائے تو باطل قوتیں سرنگوں ہو سکتی ہیں،

یہ صورت حال بڑی روح فرسا ہے کہ باپ دادا کا نام تو محمد و احمد تھا، لیکن آج ان کی اولاد پطرس یا جارج کے نام سے موسوم ہیں، یہ لوگ مردوں کو عیسائی قبرستان میں بھی دفن کرنے لگے ہیں، اور اتوار کے دن گرجا گھروں

۲۔ قرآن مجید کی تعلیم کا خاص طور سے انتظام کیا جائے۔

۳۔ عرب اور مسلم حکومتیں حکومت آسٹریلیا کو اسلامی مدارس کے قیام پر آمادہ کریں تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل دینی تعلیم حاصل کرسکے،

۴۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے عربی زبان بھی شامل کی جائے اور عرب حکومتیں اس کے لیے لائق اساتذہ فراہم کریں، نیز عرب اور مسلم حکومتیں آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں سے علمی و ثقافتی تعلقات قائم کریں،

۵۔ عرب ممالک اور اسلامی حکومتیں آسٹریلیا کے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لیں، ان کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کریں،

۶۔ اسلامی اور عرب جامعات آسٹریلیا کے مسلمانوں کو اپنے یہاں تعلیم کے مواقع مہیا کریں اور اس سلسلہ میں ان کی مالی مدد کریں،

۷۔ رابطہ عالم اسلامی اور وزارت حج و اوقاف سعودی عرب حکومت آسٹریلیا کو آمادہ کریں کہ وہ ہر سال مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کو سفر حج کی اجازت دے، ممتاز مسلمانوں کو سعودی حکومت کی طرف سے اس کی دعوت بھی دی جائے،

۸۔ اسلامی حکومتوں کی طرف سے لائق واعظین اور ائمہ مساجد کا بھی انتظام کیا جائے۔

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے غلام سلاطین اور ان کے دور کے علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ، خصوصاً اس دور کے سرآمد روزگار شعراء امیر خسرو شہاب عمید کا تعارف اور ان کے کلام کا انتخاب، قیمت :- ۱۱

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ادبیات

غزل

از

ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، الہ آباد

غم آرزو کی تلاش ہے نہ غم زندگی کی تلاش ہے
دلِ خوگرِ غمِ عشق کو غمِ واقعی کی تلاش ہے

نہ مسرتوں کی ہے جستجو نہ ہمامی کی تلاش ہے
جو سکون قلب عطا کرے اسی آگہی کی تلاش ہے

نہیں ربط کوئی اے ہم نفس مرے اور تیرے مذاق میں
میں خلیل وقت کا منتظر تجھے آذری کی تلاش ہے

کسی اہل دل سے کہو ذرا کہ جلا کے دل کرے روشنی
کہ فضائے عہد جدید کو نئی روشنی کی تلاش ہے

جو تمیزِ باطل و حق کرے جو خطا و شرک سے پاک ہو
وہی زندگی مجھے چاہیے اسی زندگی کی تلاش ہے

اسی میکدہ میں ہیں ہم بھی پہ طلب ہے سب کی جدا جدا
تجھے بےخودی کی ہے آرزو مجھے آگہی کی تلاش ہے

ہیں اگرچہ کتنے ہی غمگسار و رفیقِ غم اسی شہر میں
دل غمزدہ کو نہ جانے کیوں کسی اجنبی کی تلاش ہے

کہوں بات کوئی تو سہہ سکے جو مزاج میرا سمجھ سکے
مجھے اے طفیل بہر قدم اسی آدمی کی تلاش ہے

غزل

از ڈاکٹر افتخار احمد فخر، ایم۔ جے کالج جلگاؤں

زیر قدم قمر ہے کبھی کہکشاں کبھی
خاموش بیٹھتا نہیں عزم جواں کبھی

ہوتی جو دور رس نگہِ باغباں کبھی ‏— لٹتا بہار میں نہ مرا آشیاں کبھی

اک حال پر نہ رہتی روشِ گلستاں کبھی ‏— آتی کبھی بہار تو آتی خزاں کبھی

گمراہ خود ہی ہوتے نہ گر رہبرانِ قوم ‏— منزل سے دور رہتا نہ یہ کارواں کبھی

ہے دور لامکاں سے حدودِ نگاہ سے ‏— اس کو اسیر کر نہ سکے گا گماں کبھی

کیا بات ہے لنڈھائے چلا ہے جو خم پہ خم ‏— تھا اتنا مہرباں نہ پیرِ مغاں کبھی

کیوں آج ہیں وہ خاک بسر اور منفعل؟ ‏— تھا جن کی ٹھوکروں میں یہ خاکداں کبھی

کیا گل کھلا رہا ہے زمیں پر یہ آدمی ‏— سوچا بھی تو نے خالقِ کون و مکاں کبھی

برسے وہ آگ فخرِ جہاں میں کہ الاماں
آنکھوں سے گر عیاں ہو سوزِ نہاں کبھی

غزل

از جناب شمسی قریشی جلال پوری فیض آباد

کبھی یہ صبحِ درخشاں کبھی یہ شب کی نمود ‏— ہزار رنگ بدلتا ہے روز چرخِ کبود

وجودِ عشق سے جن و بشر، ملک کا وجود ‏— وگرنہ عالمِ ہستی تمام تر بے بود

پلا دے پھر مرے ساقی مئے انا المعبود ‏— بنا لیے ہیں جہاں نے ہزارہا معبود

دعا کرو یہ خدا سے خلیلؑ کا ہو ورود ‏— بھڑک اٹھی ہے جہاں میں پھر آتشِ نمرود

گنہگار ہوں در کرم مجھے مطلوب ‏— مجھے عزیز مئے انفعال کی ہر بوند

بغیر ہمتِ عالی، بغیر عزمِ صمیم ‏— خیالِ منزلِ مقصود بھی عبث بے سود

ہر ایک ذرے سے شمسی عیاں ہے جلوۂ طور
کبھی ہیں ذوقِ نظارہ ہے بے خبر مفقود

مطبوعاتِ جدیدہ

آپ بیتی: مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے، پتہ مکتبہ فردوس مکارم نگر برولیا لکھنؤ

یہ اردو کے نامور ادیب و انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی کی خود نوشت سوانح عمری ہے، اس کے اندر ان کی پوری زندگی کا مرقع ہے، بچپن سے بڑھاپے تک وہ جن مراحل سے گزرے اور جن نشیب و فراز سے دوچار ہوئے اسے بے کم و کاست قلمبند کر دیا ہے، اپنی سرگزشت سے پہلے اس ماحول کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اس میں خاندان کی تاریخ بھی ہے اور ماں باپ بھائی بہن اور عزیز و اقارب کا تذکرہ بھی، اسکے بعد پیدائش، بسم اللہ، اسکول اور کالج کی تعلیمی و تہذیبی زندگی، شادی، اردو اور انگریزی مضمون نگاری اور صحافت کی داستان سنائی ہے، اس سلسلہ میں الحاد کی طرف میلان اور اسکے علل و اسباب کا ذکر کیا ہے، پھر یہ بتایا ہے کہ کسطرح اس میں کمی ہوئی اور از سر نو مذہبی رنگ قائم ہوا، اس سلسلہ میں مولانا محمد علی اور اکبر الہ آبادی کے مخلصانہ اور حکیمانہ مشوروں کا بڑا اثر پڑا، اس سرگزشت کے بعد مجلس خلافت سے تعلق، بیعت و ارادت، تصنیف و تالیف اور ذوقِ شعر و سخن کا حال تحریر کیا ہے اور اپنی مالی حالت، جسمانی صحت، سفر اور خاص خاص معمولات و عادات کا ذکر کیا ہے، آخر میں ان اشخاص کا تذکرہ ہے جن سے ان کو عقیدت و محبت تھی، اس میں بزرگوں، استاذوں،

ہم عصروں اور ہمسروں کے ساتھ چند خوردوں اور عزیزوں کا بھی فراخ دلی سے ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں مولانا نے بعض ملازموں اور خدمت گذاروں کو بھی فراموش نہیں کیا ہے اسی طرح جن لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں ان سے کوتاہی ہوئی یا جن سے ان کو اذیت پہنچی ہے ان کا بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ذکر ہے، مولانا کی قوت مشاہدہ بہت تیز اور نگاہ بڑی نکتہ شناس تھی، اس لیے چھوٹا بڑا کوئی قابل ذکر واقعہ نظر انداز نہیں ہونے پایا، اپنی لغزشوں کے ساتھ دوسروں کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو بھی فراموش نہیں کیا ہے اور گفتنی و ناگفتنی سبھی باتیں بیان کردی ہیں، ان کے سحر نگار قلم نے جذبات کی ترجمانی اور واقعات کی تصویر کشی بڑے دلفریب انداز میں کی ہے، یہ کتاب صرف مولانا کی آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی بھی ہے، اس میں ان کے عہد و ماحول کی سرگذشت اور اس دور کے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، یہ اودھ کی تہذیب و معاشرت اور وہاں کے شرفا اور زمیندار گھرانوں کا ایسا آئینہ ہے، جس میں اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں نظر آتی ہیں، مولانا کے مشاہدات، تاثرات اور تجربات بڑے سبق آموز ہیں، ان کے سحر طراز قلم نے اس سبق آموزی میں ایسی دلآویزی پیدا کردی ہے کہ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد رکھنے کو جی نہیں چاہتا، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا کے ادب و انشاء کی خوبیاں اور اس آپ بیتی کی خصوصیات تحریر کی ہیں مگر اس کی قیمت زیادہ ہے۔

تجلیات حق:- از ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۵۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۵ روپیے پتہ مرکز تحقیقات و اشاعت علوم قرآن کجو نیور۔

اس کتاب میں خدا کے وجود کے دلائل بیان کیے گئے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنی آیتوں کے علاوہ موجودہ سائنسی انکشافات بھی پیش کیے گئے ہیں، مصنف نے اپنے دلائل "آفاق و انفس" کے نام سے دو حصوں میں تقسیم کیے ہیں، پہلے حصے میں کائنات کی تخلیق اس کے نظم و تدبیر، اس میں کارفرما حسن و جمال اور حکمت و کاریگری اور اس کے اندر کی بعض عظیم الشان نعمتوں کا ذکر کرکے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے اور دوسرے میں انسان کے مادۂ تخلیق، خلقت کے مدارج، جسمانی نظام، عقل، شعور، ارتقا اور تقدیر وغیرہ پر گفتگو کرکے خدا کے وجود کی دلیلیں فراہم کی ہیں اور دکھایا ہے کہ خود موجودہ سائنسی حقائق سے بھی خدا کا وجود پوری طرح ثابت ہے، آخر میں قرآن کے الہامی اور غیر انسانی کلام ہونے کے شواہد بیان کرکے خدا کا وجود ثابت کیا ہے، اس ضمن میں پانچ قرآنی آیتوں کے مضامین کی نئی سائنسی تحقیقات سے مطابقت بھی واضح کی ہے، جدید فلسفہ و سائنس نے مطالعۂ کائنات کے جو جدید اسلوب وضع کیے ہیں ان کی علمی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود مصنف سائنسی تحقیقات کے سارے ذخیرے کو درست نہیں مانتے، ان کے خیال میں گو موجودہ سائنس سے قرآن اور مذہب پر کوئی زد نہیں پڑتی، تاہم جہاں دونوں میں موافقت نہ ہو وہاں قرآن ہی کا بیان صحیح مانا جائے گا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اور سائنس کے بارہ میں ان کا ذہن صاف ہے لیکن ارتقا اور بعض دوسرے مسائل میں ان کے خیالات پوری طرح واضح نہیں ہیں، اگرچہ اس موضوع پر پہلے بھی بہت لکھا جاچکا ہے لیکن چونکہ یہ کتاب زمانہ کے موجودہ حالات اور جدید ذہن کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور اس کے اندر فلسفہ و سائنس کے ماہروں کی تحقیقات اور مفید معلومات جمع کی گئی ہیں اس لیے امید ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ

کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ: مرتبہ جناب امجد علی خاں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۴۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپے، پتہ: واجد علی شاہ اکاڈمی پبلک واچ کمپنی، مقابل کالج امین آباد، لکھنؤ۔

مولوی نجم الغنی نے اودھ کی تاریخ بڑی تفصیل سے لکھی ہے، لیکن انکی متعدد ضخیم جلدوں کا پڑھنا آسان نہیں ہے، اس لیے اس موضوع پر مختصر کتابیں بھی لکھی گئیں، جن میں مولانا عبدالحلیم شرر کی "گذشتہ لکھنؤ" بہت مشہور ہے، پیش نظر کتاب اودھ کی سلطنت کی مختصر تاریخ ہے جو چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے اور دوسرے باب میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے عہدہ داروں کے متعلق معلومات درج ہیں، تیسرے باب میں اودھ کی وجہ تسمیہ اور اس کے دونوں صدر مقاموں "فیض آباد اور لکھنؤ" کی گذشتہ شان و شوکت کا ذکر ہے، چوتھے باب میں اودھ کے حکمرانوں کی تخت نشینی اور ان کے واقعات و حالات درج ہیں، پانچویں باب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بیگم حضرت محل اور نواب برجیس قدر کی سرگرمیوں اور انگریزوں کے مقابلہ میں ان کی صف آرائی کی تفصیل پیش کی گئی ہے، آخری باب میں سلطنت کے نظم و نسق اور کارناموں کا ذکر ہے، اس کتاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاری، اس کے عہدہ داروں کی چالبازی اور انگریزوں کے جبر و تشدد اور استحصال بیجا کی پردہ دری کی گئی ہے، اور شاہان اودھ کی فیاضی و علم دوستی، رواداری، رعایا پروری اور ان کے عہد کے سیاسی، معاشی اور تمدنی حالات بیان کئے گئے ہیں، شروع میں برجیس قدر کی شبیہ اور آخر میں اودھ کی

سلطنت کا نقشہ دیا گیا ہے، مصنف نے یہ شکایت کی ہے کہ برطانوی دور میں اودھ کی جو تاریخیں لکھی گئیں، ان میں اس کے حکمرانوں کی نااہلی اور رنگیلے پن کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، اگرچہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ نہیں ہے، مگر اس میں مبالغہ آرائی بہت کی گئی ہے، مصنف نے ان الزامات کی تردید کی ہے، اور شاہان اودھ کے اچھے کاموں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے،

امرت بانی: مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۰۲، قیمت بیس روپے، پتے (۱) مہاتما گاندھی ریسرچ سنٹر، ایم۔ جی۔ ایم بلڈنگ، بمبئی، (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

یہ ہندی اور اردو کی ملی جلی شاعری کا ایک انتخاب ہے، اس کا مقصد اس گنگا جمنی زبان کا نمونہ پیش کرنا ہے، جو ناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی اور ملک کے تقریباً ہر خطہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسی کو گاندھی جی "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کرتے تھے، اور ملک کی وحدت و سالمیت کے لیے اسی کو سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے، یہ انتخاب تین حصوں پر مشتمل ہے، ایک حصہ میں غزلیں، دوسرے میں نظمیں، گیت اور بھجن، اور تیسرے میں رباعیاں، دوہے، اور چوبدے شامل ہیں، تینوں حصوں میں ہر دور کے شعرا کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے، اس طرح بوعلی قلندر، امیر خسرو، کبیر، میرابائی، الکھناتھ سوامی، محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، تلسی داس، چندر بھان برہمن، عبدالرحیم خان خاناں اور ابوالحسن تاناشاہ جیسے قدیم شاعروں سے یہ سلسلہ شروع ہوکر اس دور کے شاعروں پر ختم ہوتا ہے، اس میں ہندوستان و پاکستان، مسلمان اور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے، آخر میں مشکل لفظوں

کے سعی اشعرا کا مختصر تعارف اور ان کے کلام کی تلمیحات اور تاریخی اشاروں کی وضاحت کی گئی ہے، اور شروع میں "ہندوستانی" زبان میں لکھا گیا ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں خصوصاً اردو، ہندی اور ہندوستانی اور ان کی شاعری کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، انتخاب سلیقہ اور محنت سے کیا گیا ہے اور اس سے اردو ہندی شاعری پر مصنف کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے،

دیوان ناطق: مرتبہ جناب محمد عبد الحلیم صاحب، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۴۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپیہ
پتہ: محمد عبد الحلیم، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگ پور نمبر ۱ مہاراشٹر،

سید ابو الحسن ناطق گلاؤٹھی مرحوم اردو کے اچھے ادیب و شاعر تھے، ان کے ابتدائی دور کی نظموں کا ایک مجموعہ بہت پہلے چھپا تھا، مگر اس کے بعد کے کلام کا زیادہ حصہ تلف ہو گیا، اور جو باقی رہا وہ ادھر ادھر منتشر حالت میں تھا، کچھ عرصہ پہلے جناب ناطق مرحوم کے ایک قدردان جناب عبد الحلیم نے ان کے مضامین و مکتوبات کا ایک مجموعہ اور دیوان غالب کی شرح کنز المطالب شائع کی تھی، اور اب منتشر کلام کو جمع کر کے شائع کیا ہے، یہ دو سو غزلوں، کچھ نظموں، سہروں، تضمینوں، رباعیوں، متفرق اشعار، اور قطعات وغیرہ پر مشتمل ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں ناطق کے خاندانی حالات، ان کی تعلیم اور عام واقعات زندگی کے علاوہ ادبی کمالات اور تصنیفات کا ذکر ہے، انھوں نے یہ دیوان شائع کر کے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے، جو لائق تحسین ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۳ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

وفیات